قطرہ قطرہ احساس

مع ترمیم واضافہ

(افسانے)

اقبال حسن آزاد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

QATRA QATRA EHSAS (Short Stories)
Authored and Published by

Eqbal Hasan Azad
Retd. Principal J.R.S College Jamalpur (Munger)
Home Address : Shah Colony, Shah Zubair Road, Munger (Bihar)

Year of Edition 2024
ISBN 978-93-6062-370-8
Price ₹ 250/-

نام کتاب	:	قطرہ قطرہ احساس		
مصنف	:	اقبال حسن آزاد		
زیراہتمام	:	ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر		
سن اشاعت	:	۲۰۲۴ء قیمت	:	۲۵۰ روپے
صفحات	:	۱۶۰ تعداد	:	۱۰۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦		
کمپوزنگ	:	اعجاز رحمانی		
سرورق	:	نعیم یاد (پاکستان)		
رابطہ	:	شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر		
موبائل	:	+91 9430667003/8210498674		
ای میل	:	eqbalhasan35@yahoo.com		
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦		

ملنے کے پتے

☆ ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر ۸۱۱۲۰۱
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔٦
☆ انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی
☆ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
☆ موڈرن پبلیشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 011- 41418204, 45678286, 45678203, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

والدین کے نام

"کہ سب تیرا ہے میرا کچھ نہیں ہے......"

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے
(خاطر غزنوی)

فہرست

نمبرشمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	عرض مصنف......اقبال حسن آزاد	۷
	چندسطریں......پروفیسر عبدالمغنی	۸
	کہانی کی کہانی......شفیع مشہدی	۹
	قطرۂ احساس میں دریائے محسوسات......غضنفر	۱۲
۱	قطرہ قطرہ احساس	۱۹
۲	آگہی	۲۴
۳	انقلاب	۲۹
۴	فوجی	۳۱
۵	لامکاں	۳۴
۶	گھروندے	۳۶
۷	کارجہاں درازہے	۳۹
۸	ہتیا	۴۳
۹	نروان	۴۷
۱۰	ٹھاکرکاکنواں	۵۲
۱۱	کھوئے ہوئے سال	۵۶
۱۲	بٹاہوا آدمی	۶۲
۱۳	ضرورت	۶۷
۱۴	جیل	۷۰

۱۵	قیامت	۷۴
۱۶	کس کے لیے؟	۷۶
۱۷	پھانس	۷۹
۱۸	چھوٹا آدمی	۸۸
۱۹	دوریاں	۹۶
۲۰	ڈور	۱۰۱
۲۱	الیوژن	۱۰۶
۲۲	آئینہ	۱۱۰
۲۳	کالاتل	۱۱۸
۲۴	پاپ کے پاؤں	۱۲۶
۲۵	کھلونے	۱۳۰
۲۶	مچھلی	۱۳۳
۲۷	ڈیڈی راستہ بھول گئے	۱۳۹
۲۸	مجھے پہچانا؟	۱۴۴
۲۹	جواب	۱۵۱
۳۰	جادوگر	۱۵۷

☆☆☆

عرضِ مصنف

اقبال حسن آزاد

اوائل عمری سے ہی مجھے قصے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ دڈّا تو میرے شعور کی آنکھیں کھلنے سے پہلے ہی رخصت ہوگئی تھیں۔ البتہ ننّا کو بہت قریب سے دیکھا۔ انہیں کہانیاں سنانے کا شوق تو نہیں تھا مگر ان کی باتیں کہانیوں سے کم نہیں تھیں۔ اس کے بعد میری باجی عشرت ناز (مرحومہ) اور چچازاد بہن شمسن باجی (مرحومہ) نے میرے ذوق کی آبیاری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیارہ برس کی عمر میں میں نے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھنی شروع کر دیں اور بچوں کا ڈائجسٹ (بہار شریف)، مسرت (پٹنہ) کھلونا (نئی دہلی) نور (رام پور)، پیام تعلیم (نئی دہلی)، اور ٹافی (مالیگاؤں) وغیرہ میں شایع ہونے لگیں۔ لیکن یہ سب محض مشغلہ تھا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں میرا پہلا باضابطہ افسانہ ''انقلاب''، شمع (نئی دہلی) میں شایع ہوا۔ بعدازاں میرے افسانے شاعر (بمبئی) آجکل (نئی دہلی) اور دیگر رسالوں میں چھپنے لگے۔

۱۹۷۷ء میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''قطرہ قطرہ احساس'' بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے جزوی مالی تعاون سے ڈاکٹر قیصر جمال اور ڈاکٹر ارشد رضا کی کاوشوں سے شایع ہوا۔ اس ایڈیشن کی ساری کاپیاں ختم ہوچکی ہیں لہٰذا ریسرچ اسکالرز کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں چند ایسے افسانوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو میرے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ امید کہ قارئین کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔

☆☆☆

۲۲ر فروری ۲۰۲۴ء

چند سطریں

ڈاکٹر عبدالمغنی

اقبال حسن آزاد کے چند افسانے میں نے پڑھے ہیں، جن میں ''ہتیا'' اور ''آگہی'' خاص کر قابل ذکر ہیں۔ دونوں میں بچوں کے کردار پیش کیے گئے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے افسانے میں ایک بچہ اپنی سنجیدگی کے باوجود ماحول سے غلط الفاظ اور ان کے ساتھ غلط تصوارت سیکھتے دکھایا گیا ہے، جبکہ دوسرے میں اس سے کچھ زیادہ عمر کا بچہ ماحول کے جبر کو محسوس کر کے اس کے ساتھ موافقت کا ارادہ کرتا نظر آتا ہے۔ دونوں افسانوں میں ایک قصہ ہے اور مختصر پیمانے پر ماجرا کی ترتیب اس سلیقے کے ساتھ کی گئی ہے کہ نقطۂ عروج کا ارتقاء فطری طور پر ہوتا ہے۔ یہ افسانے دلچسپی سے پڑھے جاسکتے ہیں اور انہیں پڑھ کر آج کی زندگی کے بعض ایسے جلوے نظر آتے ہیں جو نہایت مکروہ ہیں۔ اس طرح یہ کہانیاں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سامانِ عبرت بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کو فن کے تقاضوں کے علاوہ فکر کے تقاضوں کا بھی احساس ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اگر اقبال حسن آزاد افسانہ نگاری میں فکر و فن کے تقاضوں کا لحاظ اسی طرح کرتے رہے تو وہ آئندہ بہتر سے بہتر تخلیقات پیش کرسکیں گے۔

☆☆☆

۱۲ر مارچ ۱۹۸۷ء

کہانی کی کہانی......

شفیع مشہدی

زندگی بذاتِ خود ایک کہانی ہے اور ہر چند کہ ہم نہ اس کے آغاز سے واقف ہیں اور نہ انجام سے، پھر بھی ہم اس کہانی کے کردار اور اس رول کو ادا کرتے رہے ہیں جس کا یقین بھی ہم نے نہیں کیا تھا۔ ازل سے یہ کہانی کہی جا رہی ہے اور ابد تک یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہے گا مگر یہ ابد کب آئے گا؟ ......ایک سوالیہ نشان؟ اس کا جواب بھی ہمیں معلوم نہیں۔ اس حقیقی کہانی سے ہماری وابستگی، ہزاروں ان گنت چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو جنم دیتی رہی اور ہم میں سے وہ لوگ جو مشاہدے کے ساتھ ساتھ قوتِ اظہار بھی رکھتے ہیں۔ ان ہی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو چن چن کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ داستان گوئی سے لے کر جدید انسانوں تک اسی کہانی سے نت نئے روپ دھار ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ کبھی قصۂ چہار درویش کے رنگ میں، کبھی الاؤ کے گرد بیٹھے قصہ گو کی شکل میں اور کبھی علامتوں کا لبادہ اوڑھے یہ کہانی ہمارے سامنے آتی رہی ہے۔ رنگ و روپ یا ہیئت کی تبدیلیوں کے باوجود اس کا 'کہانی پن' ہی اس کی بنیاد فطرت رہی ہے اور جس نے اس کی اس فطرت کو مجروح کرنے کی کوشش کی وہ خود مجروح ہو گیا ہے۔ الغرض کہانی کی کہانی بھی اتنی ہی دل چسپ اور تغیر پذیر رہی ہے جتنی یہ زندگی اور جس طرح زندگی 'کہانی' کا ہی دوسرا نام ہے اسی طرح کہانی نے بھی کبھی زندگی سے دامن نہیں چھڑایا ہے۔

بساطِ زندگی کے کچھ مہروں کو چن کر جب فنکار، اپنی مشاق انگلیوں سے اس کے ارد

گرد کہانی کے تانے بانے بنتا ہے تو کہانی ایک تخلیقی عمل بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ فن کار کی صلاحتیں، اس کی دیانت داری، اس کا فن اور اس کے کہانی کہنے کا انداز، اس تخلیقی عمل کو ادب میں وہ مقام دیتا ہے جس کا وہ مستحق ہو۔ فن کار ادب پارے تخلیق کرتا ہے اور ناقد اس کا تیا پانچہ کرتے ہیں۔ فن کار اور ناقد، گویا ادب کی دو متضاد شخصیتوں کے نام ہیں۔ ایک تخلیقی عمل میں گم اور دوسرا نکتہ چینی میں چیں بہ چیں نظر آتا ہے۔ گویا فن کار شناوری میں مشغول اور ناقد اس کے مول تول میں مصروف۔ خدا کا شکر ہے کہ میں خود کو ناقد کی صف میں نہیں پاتا اور اس الزام سے بری ہوں۔ اب ایسی صورت میں اگر کسی افسانوی مجموعے کا پیش لفظ لکھنے کو کہا جائے تو یقیناً یہ ایک 'دھرم سنکٹ' سے کم نہیں۔ ایک کہانی کار ناقد بن کر کہانیوں کا ایوولیشن (Evaluation) کیوں کر کرے اور میں چنداں اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ فن کار کا فن بذاتِ خود اس کا بہترین تعارف ہے اور تعریف و توصیف کی بیساکھی لگا کر کوئی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

اقبال حسن آزاد کی محبت ہی ہے کہ انہوں نے میرے ذمہ یہ خوش گوار فرض دیا کہ میں اپنی رائے سے اظہار کروں۔ اس مجموعہ کا نام ''قطرہ قطرہ احساس'' بے حد معنی خیز ہے۔ فن کار کا یہی ''قطرہ قطرہ احساس'' ایک سمندر بن سکتا ہے اور بن جاتا ہے اگر اس کی فنی صلاحتیں اور اس کی دیانت داری موضوع کے ساتھ انصاف کر پاتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ یہ ''قطرہ قطرہ احساس'' سمندر بن چکا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس میں سمندر بننے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میں نے جتنی بھی کہانیاں اقبال حسن آزاد کی پڑھی ہیں، ان میں ایک مشترک پہلو مجھے یہ نظر آیا ہے کہ ان کا مشاہدہ گہرا ہے اور زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی حسیت کہانیوں میں موج تہہ نشیں کی طرح موجزن ہے۔

اقبال حسن آزاد، ان نوجوان افسانہ نگاروں میں ہیں، جنہیں نئی نسل کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں اور جو مستقبل کے عظیم فن کار بننے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور یہ اس نسل کا حق بھی ہے۔ لہٰذا میری رائے میں ابھی ان کے افسانوں پر بہت زیادہ غور وفکر کر کے کوئی آخری رائے قائم کرنے کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ یہ آغاز سفر ہے اور خوش آئند ہے۔ ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ فن کار کا یہ قدم یقیناً منزل کی طرف گامزن ہے۔ اقبال حسن آزاد کے احساسات و مشاہدات کے یہ قطرے جو مختصر کہانیوں کی شکل میں اس کوزۂ کتاب میں بند ہیں، سمندر نہ سہی، سمندر کا جزو تو ہیں اور کون جانے کل یہی احساسات و مشاہدات پھیل کر سمندر بن جائیں۔

☆☆☆

قطرۂ احساس میں دریائے محسوسات

غضنفر

زیادہ تر لوگ ایک حالت میں بھی ہانپ جاتے ہیں مگر کچھ مردِ مجاہد ایسے بھی ہیں جو کئی حالتوں میں رہ کر بھی نہیں ہانپتے۔ ایسے ہی جیالوں میں ایک اقبال حسن آزاد بھی ہیں۔ اقبال حسن آزاد اپنے نام ہی کی طرح تین تین حالتوں میں رہتے ہیں: حالت فسانہ، حالت مدیرانہ اور حالت شاعرانہ۔ ان تینوں حالتوں کے مراقبے میں ان کی نظریں بس ایک مرکز پر مرکوز رہتی ہیں اور وہ مرکز ہے مرکزِ زبان وادب اور فکر وفن کا آستانہ۔ ان تینوں حالتوں میں اقبال حسن آزاد ایک صوفی منش کی مانندِ مستغرق رہتے ہیں۔

یہ تینوں حالتیں اقبال حسن آزاد کی تین حیثیتیں قائم کرتی ہیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت، دوسری مدیر کی حیثیت اور تیسری شاعر کی حیثیت۔

افسانہ نگار، مدیر اور شاعر، ان تینوں حیثیتوں میں جو حیثیت میرے نزدیک زیادہ بھاری بھرکم ہے وہ ہے افسانہ نگار والی حیثیت۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے ان کی مدیرانہ حیثیت بھی کم اہم نہیں لگتی۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت میں مردِ جنوں پسند کی طرح عمل کرتے ہیں۔ ارجن کی طرح ان کی نگاہ میں بھی مچھلی کی آنکھ رہتی ہے۔

'ثالث' کا نشانہ کیسے پورا ہو، اس کا وہ روپ کس طرح عملی صورت اختیار کرے جس کے خط وخال اور نقوش ان کے تصور میں موجود ہیں۔ کیا کریں کہ اس پر وہ رنگ چڑھ جائے جو

رنگ ان کا تخئیل اس پر چڑھانا چاہتا ہے۔کون سی صورت اپنائیں کہ وہ متعینہ وقت پر چھپ کر قارئین تک پہنچ جائے۔وہ اس کی ترتیب وتزئین اور طباعت واشاعت پر جتنی توجہ صرف کرتے ہیں اس سے زیادہ دھیان اس بات پر دیتے ہیں کہ رسالے کی معنویت اچھی طرح اس کے پڑھنے والوں پر واضح ہو جائے اور جو اور جس طرح کا مواد اس میں پیش کیا گیا ہے اس کی قدر و قیمت ایک ایک قاری کے ذہن ودل پر اچھی طرح واضح ہو جائے۔اس کے لیے وہ ایسی تمام تر تدبیریں بھی کرتے ہیں جن سے ادبی تحریریں اپنے استعاراتی وعلامتی معانی بھی اہل نظر اور اہل ذوق کے سامنے کھول پاتی ہیں اور اپنے پوشیدہ مال ومنال کے جواہر پارے بھی دکھا دیتی ہیں۔

اقبال حسن آزاد کی اس حیثیت کی ایک بڑی تعریف یہ بھی بنتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے فروغ کے رستے میں کسی بھی موڑ پر کسی قسم کی صارفیت کو دخل اندازی کرنے نہیں دیتے۔ دیگر رسالے کے مدیروں کی طرح نئی مدیرانہ چالبازیوں سے مضمون نگاروں کی عاقبت خراب نہیں کرتے بلکہ وہ یہ سعی کرتے ہیں کہ نئے لکھنے والوں کی کلکِ خامہ نکھر جائے، ان کی لیکھنی سدھر جائے اور مفت میں ان کی قسمت سنور جائے۔خریدار بنانے کے لیے وہ کسی بھی طرح کی زور زبردستی اور بارگیننگ نہیں کرتے اور اپنے محدود ذرائع کے باوجود 'ثالث' کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی اس کاوش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں مگر ان سب کے باوجود جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مجھے ان کی افسانوی حیثیت زیادہ وزنی، بامعنی اور اہم محسوس ہوتی ہے۔ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں تخلیقیت کو تمام کاموں اور سرگرمیوں پر فوقیت دیتا ہوں اور اسے ایک ایسا کام سمجھتا ہوں کہ اگر وہ رک جائے تو دنیا سے خوبصورتی ختم ہو جائے۔زمانے سے جمالیات کا نام ونشان مٹ جائے۔ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو مگر صرف یہ وجہ ہوتی تو مجھے ان کی شاعرانہ حیثیت بھی اتنی ہی دبیز لگتی۔

دراصل اقبال حسن آزاد کی افسانوی شخصیت میں جس قدر افسانوی وفور، تخلیقی شعور اور سب سے بڑھ کر والہانہ پن محسوس ہوتا ہے اس قدر یہ اوصاف ان کی دوسری حیثیتوں میں محسوس نہیں ہوتے۔ان کے ابتدائی دور کے مختصر ترین افسانے ہوں، یا بعد کے زمانے کے مختصر افسانے سب میں ان افسانوی وفور، تخلیقی شعور اور والہانہ پن موجود ہیں۔جن خوبیوں کو مولانا حالی پانی پتی نے شاعری کے لیے ضروری قرار دیا تھا وہ اقبال حسن آزاد کی افسانوی تحریروں میں موجود ہیں۔یعنی سادگی، صداقت اور خلوص جیسی صفات سے ان کی تمام تر کہانیاں متصف ہیں۔ان کی کہانیاں پڑھتے وقت دماغ کی ہڈیاں نہیں چٹختیں، نہ ہی پیٹ کا ہاضمہ خراب ہوتا ہے۔اکہرے پن کی اکتاہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی۔

سادگی میں جب صداقت کا رنگ گھل جاتا ہے اور خلوص کا جذبہ شامل ہو جاتا ہے تو سادہ بیانی بھی پرکشش ہو جاتی ہے اور تحریر میں تہہ داری ڈھونڈنے والوں کو بھی تہہ داری کی کمی نہیں کھٹکتی۔ان اوصاف کو اقبال حسن آزاد نے کم وبیش اپنی سبھی کہانیوں میں برقرار رکھا ہے۔

سچ کو اگر شدت سے محسوس کیا جائے تو وہ بنا کسی پیچ کے اظہار پا جاتا ہے۔شدت سے محسوس کی گئی صداقت بنا کسی رکاوٹ کے ظاہر ہو جاتی ہے۔اور جو اظہار بنا کسی رکاوٹ یا پیچ کے معرض وجود میں آتا ہے اس میں سادگی در آتی ہے۔اقبال حسن آزاد کے افسانوں کے اظہار میں سادگی اسی لیے دکھائی دیتی ہے کہ وہ معاشرے کی سچائیوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔انھیں اپنے رگ وریشے میں اتارتے ہیں۔اور ان میں سے بیشتر کو جیتے بھی ہیں۔

اقبال حسن آزاد کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' کے دیباچے میں سنیئر افسانہ نگار شفیع مشہدی صاحب نے اگرچہ ان کے افسانوں کی خوب پذیرائی کی ہے مگر یہ بات لکھ دی ہے:

''اقبال حسن آزاد نوجوان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھیں نئی نسل کی ذمے داریاں سنبھالنی ہیں اور جو مستقبل کے عظیم فن کار بننے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور یہ ان کا حق بھی ہے۔لہٰذا میری رائے میں ابھی ان کے افسانوں پر زیادہ غور وفکر کر کے کوئی آخری رائے قائم کرنے کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔''

مشہدی صاحب نے شاید یہ بات اس لیے لکھ دی ہوگی کہ اقبال حسن آزاد اس وقت افسانوی میدان میں نووارد تھے اور جیسا کہ نو واردوں کے متعلق سنئیر ادیبوں کا مشفقانہ رویہ عام طور پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے جونئیر وں پر لکھتے وقت حوصلہ افزائی کے ساتھ کوئی نہ اِف اینڈ (بَٹ) بھی لگا دیتے ہیں۔ مجھے اس وقت دہلی کے سیمنار کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ایک نوجوان کو مقالہ پڑھنے کے لیے دعوت دی گئی تو یہ کہا گیا کہ صاحب مقالہ رسرچ اسکالر ہیں اور ان کا مقالہ ایک رسرچ اسکالر کو سامنے رکھ کر سنا جائے جبکہ اس نیو کمر کا مقالہ کئی سنئیر مقالہ نویسوں کے مقالوں پر بھاری تھا۔خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا،اصل بات تو میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ اپنے ابتدائی افسانوی مجموعہ ''قطرہ قطرہ احساس'' کا خالق نووارد ضرور ہے مگر اپنے افسانوں میں وہ بالغ نظر اور پختہ ذہن فن کار محسوس ہوتا ہے۔زبان و بیان میں بھی کہیں سے کوئی کچا پن دکھائی نہیں دیتا۔یقین نہ آئے تو ان اقتباسات کی زبان پر نظر ڈال لیجیے:

''مئی کی دھوپ جب آنگن کے پختہ فرش کو جلانے لگی اور گرم ہوا کے بگولے چاروں طرف گردش کرنے لگے تو آرام کرسی پر نیم دراز ڈاکٹر صاحب نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے ایک اچٹتی سی نظر سارے گھر پر ڈالی۔چاروں کمرے بند پڑے تھے۔باورچی خانہ بھی سنسان پڑا

تھا۔کہیں پر کوئی آہٹ،کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔گھر کا ویرانہ پن انہیں اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔'' (افسانہ: قطرہ قطرہ احساس)

''انتظار...... کتنا پیارا لفظ ہے جیسے سارے جہاں کا رومان اس ایک لفظ میں سمٹ کر آ گیا ہے۔اس لفظ کو سنتے ہی ذہن پر ایک ست رنگا پردہ کھنچ جاتا ہے، دروازے کی کوئی چوکھٹ،کوئی ادھ کھلا کواڑ، کھڑکی کا کوئی پٹ اور پٹ کو تھامے ہوئے کوئی حنائی ہاتھ...... چوڑیوں سے سجا، دو آنکھیں ستاروں سی جھلملاتی، کچھ کہی کچھ ان کہی باتیں،کوئی دھڑکن کوئی آہٹ، ہوا کی سرسراہٹ پتوں کے ہلنے کی آواز،فضا میں گونجتی ہوئی سرگوشی...... کتنی ہی تصویریں اس ایک لفظ سے وابستہ ہیں مگر اس تصویر کی آنکھوں میں جو انتظار ہے اس میں نہ چاند ہے نہ ستارے،نہ چوڑیوں کی کھنک ہے،نہ ہواؤں کی سرسراہٹ۔ان آنکھوں میں صرف اور صرف ایک چیز نظر آتی ہے اور وہ ہے موت، کسی کیڑے کی مانند دھیرے دھیرے اس کے وجود کو چاروں طرف سے گھیرتی ہوئی،اپنے شکنجے میں جکڑتی ہوئی قطرہ قطرہ موت۔'' (کار جہاں دراز ہے)''

''انسان نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو وہ بالکل غیر محفوظ تھا۔وہ پہاڑوں پر رہتا تھا،جنگلوں میں بسر کرتا تھا،جانوروں سے ڈرتا تھا،ان دیکھی وباؤں کا شکار ہوتا تھا لیکن اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔باغ بہشت سے اسے جو حکم سفر ملا تھا اسے وہ حکم یاد تھا۔زمانہ کروٹیں لیتا رہا۔جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔پرانے پتے جھڑتے رہے۔نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔

بہار سجاتی رہی۔خزاں اجاڑتی رہی۔انسان نے بستیاں بسائیں، جنگیں لڑیں۔ہار جیت ہوتی رہی۔انسان کا وحشی پن دھیرے دھیرے اس سے جدا ہوتا رہا مگر نہیں صرف یہ ایک خول تھا۔‘‘ (کارِ جہاں دراز ہے)

’’ہر بار...... ہاں ہر بار کوئی زنجیر اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا کرتی۔ ایسا لگتا جیسے اس کی ساری زندگی ان زنجیروں کو کاٹنے میں گذر جائے گی۔ الگ الگ قسم کی زنجیریں......کوئی بھاری، کوئی بہت بھاری اور کوئی بہت زیادہ بھاری۔حالانکہ وہ ان میں سے کئی زنجیروں کو کاٹ چکا تھا مگر پھر بھی اس جانے پہچانے گیٹ کے سامنے اس کے قدم رکے کھڑے تھے۔وہ جب بھی قدم بڑھانا چاہتا زنجیر کی جھنکار اس کے کانوں میں گونج اٹھتی۔یہ کون سی زنجیر تھی؟ شرم، جھجک یا پھر غربت اور نکبت کی......‘‘ (پھانس)

یہ اقتباسات میرے اس دعوے کے ثبوت ہیں کہ اقبال حسن آزاد کے ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی زبان و بیان کی صفائی کے ساتھ زبان کی خوبصورتی اور بیان کی شگفتگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

اس مجموعے کے عنوان ’’قطرہ قطرہ احساس‘‘ سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار نے ان افسانوں کا مواد شدت سے محسوس کی گئی زندگی کے محسوسات اور بھوگے گئے تجربات سے کشید کیا ہے۔ان افسانوں کے موضوعات یہ بھی محسوس کراتے ہیں کہ زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی افسانہ نگار کی آنکھوں میں وہ نظر پیدا ہوگئی تھی جو اشیاء کی تہوں تک نہ صرف یہ کہ پہنچ جاتی ہے بلکہ موتی بھی نکال لاتی ہے۔

یہاں حالی کے بتائے گئے وصف صداقت کے ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہوگا کہ

صداقت کو وہی بیان کر سکتا ہے جس کی شخصیت میں بے باکی ہو اور جو مصلحت کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا ہو۔اقبال حسن آزاد کی شخصیت کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے، جنھوں نے ان کے اداریوں کو پڑھا ہے اور جو لوگ فیس بک پر ان کے کمنٹس اور پوسٹ پر نظر رکھتے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ اقبال حسن آزاد کس قدر نڈر انسان ہیں اور اپنے ہم نام علامہ اقبال ہی کی طرح کسی کے بھی سامنے ان کی کمزوریوں خامیوں اور ناہمواریوں پر چپ نہیں رہ پاتے۔ان کی یہی بے خوفی سچ کو سچ کہنے کی ہمت ان میں پیدا کرتی ہے جو ان کی کہانیوں میں بھی منعکس ہوتی ہے۔

بلاشبہ ’’قطرہ قطرہ احساس‘‘ کے بعد کی کہانیاں محسوسات کے دریا کی سیر کراتی ہیں کہ اقبال حسن آزاد کی آنکھوں میں وقت کی رفتار کے ساتھ وسعتِ نظری بھی پیدا ہوتی گئی ہے اور ان کا ذہن زیادہ بالیدہ اور احساس زیادہ حساس ہوتا رہا ہے۔یہ ان کے اسی بالیدہ ذہن اور حساس احساس کا کمال ہے کہ جنھوں نے اس دریا کے ساحل کے کینوس پر ایک ایسا ’’پورٹریٹ‘‘ بنا دیا جس سے زندگی کی دھنک ہی نہیں چھوٹتی بلکہ شعور و آگہی کی شعاعیں بھی منعکس ہوتی ہیں۔

☆☆☆

۶؍فروری ۲۰۲۴ء

قطرہ قطرہ احساس

مئی کی دھوپ جب آنگن کے پختہ فرش کو جلانے لگی اور گرم ہوا کے بگولے چاروں طرف گردش کرنے لگے تو آرام کرسی پر نیم دراز ڈاکٹر صاحب نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے ایک اچٹتی سی نظر سارے گھر پر ڈالی۔ چاروں کمرے بند پڑے تھے۔ باورچی خانہ بھی سنسان پڑا تھا۔ کہیں پر کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ گھر کا ویرانہ پن انہیں اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔ پچھتر برس کی عمر تک انہوں نے ایسا سناٹا، ایسی ویرانی کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ گھبرا اُٹھے۔

''دادا ابا! دیکھئے میری فراک کا نیا کپڑا۔'' ان کے کانوں میں سیما کی ہنستی ہوئی آواز ٹکرائی اور انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ مگر وہاں پر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ہوا کے زور سے دروازے کے پٹ ہل رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں میں پھنسی ایک ہلکی سی آہ آزاد ہو کر فضاء میں تحلیل ہوگئی اور ان کے سامنے ان کی پندرہ سولہ سالہ پوتی سیما آ کھڑی ہوئی۔

''دادا ابا! چلئے کھانا کھا لیجئے۔''

''دادا ابا! آج آپ نہائے نہیں؟''

''دادا ابا! دادا ابا!! دیکھئے پاپا کا خط آیا ہے۔''

''دادا ابا!.....''

''دادا ابا!!.....''

وہ گھبرا اُٹھے۔ انہیں گھر کے ہر ہر کونے میں مسکراتی ہوئی، ہنستی ہوئی، روٹھتی ہوئی سیما نظر آنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیما کسی پرچھائیں کی طرح نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

''اب وقت اتنا رک رک کر کیوں چلتا ہے؟'' انہوں نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔ مگر ابھی صرف گیارہ بجے ہیں اور ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ دو سگریٹ وہ پہلے ہی پی چکے ہیں۔ ایک شام کو پئیں گے۔ چوتھی کے لیے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔ اخبار بھی کتنا مختصر ہونے لگا ہے۔ صبح سے کئی بار پڑھ چکے ہیں۔ کئی چھوٹی موٹی خبریں تو یاد سی ہو گئیں ہیں۔ ادھر وہ کئی ہفتوں سے گھر کی صفائی کروا رہے تھے۔ مگر وہ کام بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ فرنیچر نئے سرے سے ترتیب پا چکے ہیں۔ گھر کا کونا کونا صاف ہو چکا ہے۔ اب تو کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں جو ان سجے سجائے بستروں کو تتر بتر کر دے۔

انہوں نے دیکھا۔ ان کا بڑا لڑکا رشید بستروں کو روند رہا ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا رشید اسکول سے پڑھ کر آ رہا ہے....اور پھر رشید بڑا ہوتا گیا.....اور بڑا ہوتا گیا۔ اس کی شادی ہوئی، بچے ہوئے اور پھر.....

انہوں نے ایک ٹھنڈی طویل سانس بھری۔

''ابا! ابا!! دیکھئے میرا پاسپورٹ بن کر آ گیا'' رشید ان کے سامنے ہاتھوں میں اپنا پاسپورٹ لیے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''دیکھئے اب ویزا کب تک ملتا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی مل جائے گا۔''

کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو ان کی آنکھوں کے سامنے سے ماضی کا پردہ ہٹ گیا۔ پھر وہ آہٹیں سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر کہیں گم ہوگئیں۔ ان کے دل میں آیا، اوپر چل کر کرایہ داروں سے بات کریں۔ مگر وہ آدھے دھڑ سے اُٹھ کر پھر بیٹھ گئے۔ آجکل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ ایک بوڑھے اور بیکار شخص سے گفتگو کرے۔ انہوں نے سگریٹ کے

ڈبے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔چلو ایک اور پی لیتے ہیں۔کیا فرق پڑتا ہے،کون دیکھنے کے لیے آ رہا ہے؟اور پھر کتنا جییں؟؟ان کے ہاتھوں نے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا لیا اور سگریٹ ان کی اُنگلیوں میں آ گئی۔

''دادا ابا!آپ پھر سگریٹ پی رہے ہیں؟''اسلم پیار بھرے لہجے میں ان سے کہہ رہا تھا۔انہوں نے اپنے جوان پوتے کے مضبوط قویٰ پر ایک نظر ڈالی اور پھر کھسیا کر بولے۔

''میں سگریٹ پی کہاں رہا ہوں،بس دیکھ رہا ہوں۔''اپنی بڑبڑاہٹ سن کر وہ چونک پڑے۔سامنے اسلم کی جگہ سرگوشیاں کرتی ہوئی ہوائیں گشت کر رہی تھیں اور دھوپ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔وہ اُٹھے اور لیٹر بکس کی جانب بڑھے۔شاید رشید نے امریکہ سے کوئی خط لکھا ہو۔مگر خالی لیٹر بکس دیوار سے لگا گویا ان کا منہ چڑا کر کہہ رہا تھا۔

''میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

انہیں یاد آیا۔پہلے رشید اکیلے ہی امریکہ گیا تھا۔پھر اسلم گیا۔ان کی بہو اور پوتی سیما بعد میں گئیں۔جب تک ان کی بہو اور پوتی یہاں تھیں تب تک پابندی سے رشید کے خط آتے رہے تھے۔مگر جب سے بہو گئی ہے،صرف ایک خط آیا ہے۔وہ واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔گھڑی کی سوئیاں انہیں جامد دکھائی دینے لگیں۔اتنا سارا وقت وہ کسے دیں؟وقت کی یہ دولت کوئی بھی اپنے نام کرنے کو تیار نہیں۔ہر کسی کے پاس اپنا اپنا وقت ہے۔کاش کوئی آ کر ان سے وقت لے جاتا مگر اس ویران گھر میں کون آئے؟یہاں اب ہے ہی کون؟؟لمحہ لمحہ موت کی طرف قدم بڑھاتا ایک بوڑھا شخص،اس کا بیمار بیٹا اور ایک بیمار بہو۔حمید بھی کتنا فرمانبردار لڑکا ہے۔چالیس برس کی عمر تک اس نے یہ سوچ کر شادی نہیں کی کہ پتہ نہیں کیسی بیوی آئے۔ہو سکتا ہے کہ وہ آ کر میرے بوڑھے باپ کے دکھوں میں اور اضافہ کر دے۔ڈاکٹر صاحب جب بھی

اس سے شادی کے لئے کہتے تو وہ جواب دیتا کہ''پانچ سو کی نوکری میں اسے کہاں سے کھلاؤں گا؟اور پھر میں خود ہمیشہ بیمار رہتا ہوں۔''انہوں نے بھی کوئی خاص زور نہیں دیا۔لیکن جب ایک دن ان کے بڑے لڑکے نے اپنا پاسپورٹ لا کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیا تو وہ آنے والے مستقبل کے اکیلے لمحوں کے بھیانک خیال سے ڈر گئے۔اور آخر انہوں نے حمید کی شادی کروا ہی چھوڑی۔ان کا خیال تھا کہ بڑی بہو کے امریکہ جاتے ہی چھوٹی بہو کے بچے کی قلقاریاں گھر میں گونجنے لگیں گی۔لیکن یہ خواب بھی اس وقت سطح آب پر بکھری ہوئی لہروں کی طرح ٹوٹنے لگا جب ان کی چھوٹی بہو کے سرہانے ہمیشہ دوائیوں کے ڈھیر رہنے لگے۔

رات سے پھر بہو کی طبیعت خراب تھی اور وقت حمید اسے لے کر ہاسپٹل گیا ہوا تھا۔پتہ نہیں کس وقت ان کی واپسی ہو۔

وہ کرسی پر لیٹے لیٹے اونگھ گئے۔اچانک گلیارے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔سامنے اشرف کھڑا تھا...... پڑوس کا لڑکا۔اس نے انہیں ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔

''سلام دادا ابا!''

''جیتے رہو۔''انہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔وہ ان کے پاس بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گیا۔انہوں نے سوچا کہ پہلے کتنے لوگ آتے تھے......کمال،نسیم،قیصر،اشرف......سبھی آتے تھے۔اور یہ اشرف تو روز گھنٹوں آ کر بیٹھا رہتا تھا۔مگر اب یہ بھی کبھی کبھی آتا ہے۔خیر یہی کیا کم ہے کہ آ جاتا ہے۔آج بھی جب وہ آتا ہے تو جیسے ان کی تنہائی کا درد تھوڑی دیر کے لیے مٹ جاتا ہے۔مگر اشرف اس گھر کے سونے پن سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

''چچی جان کہاں ہیں؟''

''ہاسپٹل گئی ہیں۔رات سے ان کے پیٹ میں درد تھا۔''

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ چپ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے جیسے سب کچھ بھول گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ اب اشرف سے کچھ باتیں ہونگی۔ اس کے امتحان کے بارے میں، اس کی پڑھائی کے بارے میں، اس کے گھر کے بارے میں۔ لیکن وہ سارے سوالات ایک ساتھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ رہے اور وہ اُٹھ کر چلا جائے۔ انہوں نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر کچھ رک کر اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا۔ اشرف نے مختصر سا جواب دیا اور بے زاری کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چچی نے ایک ناول مانگا تھا، اسے واپس لینے آیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ شام کو پھر آجاؤں گا۔"

اور وہ دروازے میں جا کر گم ہو گیا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور آرام کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں

☆☆☆

آ گہی

میز پر رکھی گھڑی نے جب آٹھ بجائے تو سارا کمرہ الارم کی تیز آواز سے گونج اُٹھا۔ مسز جاوید نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی طرف دیکھا اور اس طرح ناگواری کے انداز میں ہونٹ سکوڑے گویا اس بے جان سے کوئی بدتمیزی سرزد ہو گئی ہو۔ کچھ دیر تک وہ یونہی پڑی رہیں۔ پھر ایک طویل انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھیں۔ اس عمل کے دوران ان کی گلابی رنگ کی شکن آلود نائٹی آگے کی جانب سے تن سی گئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے مسٹر جاوید نے نیم وا آنکھوں سے یہ توبہ شکن نظارہ دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھ بیٹھے۔

"کیوں ڈارلنگ! صبح ہو گئی کیا؟؟"

"کیسے سمجھوں؟ جب تک وہ نامراد بیڈ ٹی لے کر نہیں آتا ہے، صبح کیسے ہو سکتی ہے۔"

اور پھر انہوں نے بلند آواز سے اس نامراد کو پکارنا شروع کیا۔ اور باورچی خانے میں چائے بناتے بناتے اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"کہاں تھے لاٹ صاحب! یہ وقت ہے چائے لانے کا؟" مسز جاوید نے اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جی! وہ بات یہ ہے کہ....." اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"بات کے بچے! کان کھول کر سن لو۔ اگر آئندہ کبھی دیر ہوئی تو چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دی جائے گی، سمجھے؟"

بقرعید کے موقع پر چمڑی اُدھیڑا ہوا خصی اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ موٹی رسی کے

سہارے اُلٹا لٹکا ہوا......جس کی گردن دھڑ سے الگ ہو چکی تھی اور خون ٹپک ٹپک کر سارے میں پھیل رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سہر اُٹھا۔ مسز جاوید کی دھمکی سن کر اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔

''جی سمجھ گیا۔'' اور اس نے سعادت مندی کے ساتھ گردن ہلا دی۔

جب سامنے والا حد سے زیادہ نرم ہو تو انسان کے تنے ہوئے اعصاب خود بخود ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ مسز جاوید نے قدرے ملائم لہجے میں پوچھا۔

''جھاڑو دے دی؟

''جی!''

آٹا گوندھ لیا؟''

''جی!''

''دودھ لے آیا؟''

''جی!''

''ٹھیک ہے۔''

پھر انہوں نے سرہانے رکھے پرس سے روپئے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ جا کر سبزیاں لے آؤ۔ بھنڈی اگر تازہ ہو تو آدھا کیلو لے لینا اور ایک کیلو آلو بھی۔''

وہ جانے کے لئے مڑا۔

''اور سنو! ایک درجن انڈے بھی لے لینا اور دھنیا پتی، ہری مرچ، لیموں، مولی، گاجر، ٹماٹر وغیرہ بھی۔ دن کے کھانے میں سلاد ضرور لینا چاہئے۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔''

انہوں نے اپنے سڈول بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی بہت اچھا۔'' یہ کہ کر وہ تیزی کے ساتھ مڑا اور تھیلا لے کر باہر نکل گیا۔ وہ جانتا

تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور رکا تو یہ فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں اس کے ناتواں کندھوں کو بھاری تھیلے کا بوجھ اُٹھانا پڑ جائے گا۔ ویسے اسے معلوم تھا کہ بازار سے واپسی پر بھی اس کے کان احکامات وصول کرتے رہیں گے۔

''بابو! برتن صاف کر دو۔''

''بابو! کوئلے توڑ دو۔''

''بابو! چولہا سلگا دو۔''

بابو! صاحب کا ٹفن پہنچا آؤ۔''

''بابو! یہ کرو۔''

''بابو! وہ کرو۔''

اور اداس آنکھوں اور اُلجھے بالوں والا بابو آٹھ نو برس کی چھوٹی سی عمر میں مشین کی طرح ہر کام کیے جاتا۔ صبح، بہت سویرے جبکہ سورج ابھی مشرق میں طلوع بھی نہیں ہوتا تھا، اسے بستر چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگر مسٹر یا مسز جاوید کی آنکھ اس کے بیدار ہونے سے پہلے کھل گئی تو اسے اپنی پیٹھ پر بنے نشانات کا درد سہنا پڑے گا۔ اور چونکہ وہ ان نشانات کے درد کو برداشت کرنے کا اہل نہیں تھا، اس لیے وہ راتوں میں کئی بار چونک اُٹھتا تھا۔ اس کے دماغ میں ساری رات ایک ہی خیال گردش کرتا رہتا تھا۔

''کہیں صبح نہ ہو جائے!''

''کہیں صبح نہ ہو جائے!!'' کیونکہ ہر صبح اس کے لئے طرح طرح کے کاموں کی لمبی فہرست لے کر آتی۔ اسے تو رات اور رات کی سیاہی بہت پیاری تھی۔ شاید اس لیے کہ کاتب تقدیر نے اس کی پیشانی پر سیاہی بکھیر دی تھی۔ اکثر جب وہ رات کے بارہ ایک بجے جوٹھے

برتنوں کو صاف کرنے کے بعد اپنے پھٹے پرانے بستر کو زمین پر بچھا کر سونے کے لیے لیٹتا تو اسے وہ منحوس صبح یاد آجاتی ، جس روز آسمان پر بادل چھائے تھے۔اس کی آنکھ یوں تو وقت پر کھل گئی تھی لیکن ہر طرف اندھیرا دیکھ کر وہ پھر سو گیا تھا، اور پھر اس کی آنکھ مسٹر جاوید کے پیروں کی ٹھوکروں سے کھلی تھی ۔ اور پھر اس دن سے اس کی پیٹھ پر بہت سارے نیلے نشانات ابھر آئے تھے۔اب بھی جب کسی رات میں بستر پر لیٹے لیٹے اس کا ہاتھ پیٹھ پر چلا جاتا تو بے اختیار اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل جاتی اور آنکھوں کے کونے بھیگ جاتے ۔

وہ شاید پہلی صبح تھی ، چاندی کی طرح چمکتی ہوئی ، جب مشرق میں طلوع ہوتا ہوا سرخ سورج بابو کو بڑا ہی پیارا لگا تھا، اس روز اسے کوئی کام نہ کرنا پڑا تھا۔مسز جاوید نے اپنے بیٹے راشد کی اچھی شرٹ اسے پہننے کو دی تھی ۔ اور اس دن ان سبھوں کے ساتھ مل کر دسترخوان پر کھانا کھایا تھا۔اس دن اس کی ماں آئی تھی ، اس کی کمزور بیوہ ماں ، جس کی نگاہوں کی قندیل وقت سے پہلے ہی بجھ چکی تھی اور پانچ بچوں کی پرورش کرتے کرتے اس کے چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی تھیں اور ایسے میں جب اس کی بہن ، مسز جاوید نے بابو کو اپنے گھر لے جانے کی تجویز رکھی تو اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔اس نے سوچا اس کے بیٹے کی قسمت اچھی ہے جو وہ ایک بڑے گھر میں جا رہا ہے۔
وہ لفظ ’قسمت‘ سے بہت خائف رہا کرتی۔ یہ قسمت ہی تھی کہ ایک بہن کی صبح تو بغیر بیڈ ٹی کے طلوع نہیں ہوتی تھی ۔ اور دوسری کو اسی یک پیالی چائے کے لیے پتہ نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔حالانکہ بابو کو خود سے جدا کرتے ہوئے اسے دکھ ہو رہا تھا۔مگر حالات نے اسے کچھ اس طرح سے کچلا تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی اور اس طرح بابو اپنی خالہ کے پاس آ گیا۔شروع کے چند روز تو بڑے اچھے گذرے۔
لیکن دھیرے دھیرے اپنی خالہ کا مقصد اس کی ننھی سمجھ میں آنے لگا۔اس کا بستر پلنگ سے اٹھ کر فرش پر آ گیا۔اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں کتابوں کے بجائے کوئلے توڑنے کا ہتھوڑا تھما دیا گیا اور

پھر اسی طرح شب و روز گذرنے لگے۔اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

اور ایک دن اس کی ماں اس سے ملنے آئی ۔ وہ دن بھر اپنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا رہا۔ اور اس کی خالہ اس کی تعریفیں کرتی رہیں۔رات میں جب اس کی ماں کے لیے ایک الگ بستر لگایا گیا تو اس کی ماں نے کہا۔

’’بابو! آج تو بھی میرے ساتھ سو جا۔کتنی مدتوں سے میں نے تجھے اپنے ساتھ نہیں سلایا ہے۔‘‘ اور اس رات جب اس کی ماں کی گرم آغوش ملی تو اسے اپنا سارا وجود محبت کی آغوش میں سمٹا سمٹا سا لگا ، بالکل محفوظ سا لگا ، لیکن اس کی ماں نے اس کے سینے کی ہڈیوں کو محسوس کیا ، اس کے زرد اور پیلے چہرے کو دیکھا اور جیسے سب کچھ سمجھ گئی اس نے بابو سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ، کہنے لگی۔

’’بابو! کل تو میرے ساتھ چلے گا۔میں تجھے ان لوگوں کے بیچ نہیں چھوڑ سکتی۔‘‘

’’کیوں ماں؟‘‘ وہ حیرانی سے پوچھ بیٹھا ، اس کی ماں کا دل گویا سینے میں پھڑ پھڑا کر رہ گیا ہو۔ اس نے بابو کو سینے سے چمٹا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

’’یہ لوگ تجھے مار ڈالیں گے پگلے۔‘‘

’’نہیں ماں میں تو بہت مزے میں ہوں ، میں نہیں جاؤں گا ‘‘ اور پھر وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر روہانسے انداز میں کہنے لگا۔

’’ماں مجھے یہیں رہنے دو نا ‘‘ اور اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔اس کی ماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا بابو اب بچہ نہیں رہا ، بڑا ہو گیا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے ، سب سمجھتا ہے۔اور رات کے اندھیرے میں ماں بیٹے کی سسکیاں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

انقلاب

''انقلاب زندہ باد!''

''انقلاب زندہ باد!!''

''انقلاب زندہ باد!!!''

ساری فضا عوام کے پُر جوش نعروں سے گونج رہی تھی۔ان کے زوردار اور بلند آہنگ نعرے اس بات کی دلیل تھے کہ وہ سب کے سب شکم سیر بھی تھے اور مطمئن بھی۔ان کے ہاتھوں میں لال جھنڈے تھے اور زبان پر انقلاب کے نعرے۔

اسی وقت ''وہ'' نمودار ہوا۔ساری نگاہیں اس کی جانب مُڑ گئیں۔اس نے عوام کو نئے نئے نعرے دیے اور عوام نے اسے اپنے کندھوں پر اُٹھالیا۔اس نے طالب علموں سے کہا۔

''پڑھنا لکھنا چھوڑ دو،امتحانات کا بائیکاٹ کرو۔اور ضرورت پڑنے پر توڑ پھوڑ بھی کرو۔''

اس نے سرکاری ملازموں سے کہا۔

''زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرو۔آفسوں میں ہڑتال کر دو اور حکم عدولی کرنا سیکھو۔''

عوام کا جوش بڑھتا گیا......بڑھتا گیا اور آخر کار اس نے ایک تیز و تند آندھی کی شکل اختیار کر لی جس کی زد میں آ کر حکومت کا تختہ پلٹ گیا۔چاروں طرف خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔لوگ فرطِ مسرت میں دیوانے ہو گئے اور سڑکوں اور گلیوں میں نکل وحشیانہ رقص کرنے لگے۔

پھر دھیرے دھیرے عوام کا جوش کم ہوتا گیا۔زندگی معمول پر آنے لگی۔نئی حکومت ان کی اپنی تھی۔کسی کا ڈر......کسی کا خوف نہیں تھا۔اسکول اور کالج میں امتحانات شروع ہوئے

قطرہ قطرہ احساس

اور جب طالب علموں کو نقل کرنے کی اجازت نہیں ملی تو انہوں نے ہنگامہ کر دیا اور توڑ پھوڑ مچانے لگے۔وقت پر تنخواہیں نہ ملنے پر سرکاری ملازمین نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔''اسے'' ایک بار پھر سامنے آنا پڑا۔اس نے لوگوں سے امن اور شانتی برقرار رکھنے کی اپیل کی اور کام پر واپس آنے کے لیے کہا۔لوگوں نے جواب دیا۔

''واہ!تم نے ہی تو ہمیں سکھایا تھا کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ دو،کام نہ کرو اور حکم عدولی کرنا سیکھو۔جب بغیر محنت کیے ہم سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں......ہمیں ڈگریاں مل سکتی ہیں......روزی روٹی مل سکتی ہے تو پھر ہم پڑھائی لکھائی کیوں کریں......کوئی کام کیوں کریں۔''

اور پھر وہ سب ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے۔

اور ''وہ'' حیران سا کھڑا اس جلوس کو جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

فوجی

اس کی لال لال، شعلے برساتی آنکھوں میں بلا کی وحشت جھانک رہی تھی۔ بال اُلجھے اُلجھے اور گرد آلود تھے۔ کانٹوں جیسی بڑھی ہوئی داڑھی کے درمیان بے ترتیب اور گھنی مونچھیں اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ عجیب انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ ایک ٹک جھونپڑی کے دروازے سے لگی بیٹھی اپنی بوڑھی اور نحیف ماں کی طرف دیکھے جا رہا تھا، جو دروازہ اندر سے بند کیے، اس سے پیٹھ لگائے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی دھندلائی آنکھوں سے پانی نکل نکل کر اس کے جھریوں بھرے چہرے کو گیلا کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رو نہ رہی ہو بلکہ آنسو یوں ہی اس کے گالوں پر لڑھک رہے ہوں۔ اس نے انہیں پونچھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔

اس کا بیٹا ایک بار پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور اونچی آواز میں گرجا۔

''ماں! میں کہتا ہوں مجھے جانے دے۔''

''نہیں، میں تجھے اس وقت تک نہیں جانے دوں گی جب تک تو میرے سوالوں کا جواب نہیں دے گا۔'' بوڑھی عورت نے کچھ اس قدر پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز میں یہ بات کہی کہ اس کے سامنے اس کا چھ فٹ لمبا تڑنگا بیٹا اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنی ماں کے کسی بھی سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رہا تھا۔ دراصل وہ اپنی ماں کے سوالوں کا جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت اسے اتنی فرصت کہاں تھی۔ اس کی نگاہوں میں تو ایک سانولا، سنولا، کسا کسایا جسم گھوم رہا تھا اور ساتھ میں ولایتی شراب کی بوتل بھی۔ اس نے جیب میں پڑی نوٹوں کی گڈّیوں کو دھیرے سے سہلایا اور ایک بار پھر اپنے موٹے اور بھدّے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کھڑا ہو گیا اور ذرا سخت آواز میں بولا۔

''ماں! میں کہتا ہوں مجھے جانے دے۔''

''نہیں پہلے تو یہ بتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟''

''تو اور کیا کرتا؟ یہی تو میرا دھندا ہے۔''

''ہونہہ، دھندا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''کیا تجھ میں تیرے مرے ہوئے بھائی کی ایک بھی خوبی نہیں ہے؟''

''وہ کون سا اَہنسا وادی تھا؟ آخر کو وہ بھی ایک فوجی ہی تھا۔ پتہ نہیں کتنوں کی جان لی تھی اُس نے۔''

''اُس نے وہ جانیں دشمنوں کی لی تھیں۔''

''تو میں نے کون سا دوستوں کو مارا ہے؟'' وہ جھنجھلا اُٹھا۔

''تجھے پتہ ہے کہ جس گھر میں تو نے آگ لگائی، وہ اس نیک دل اور مہربان بوڑھے کا تھا جسے تو بچپن سے چاچا کہتا آ رہا تھا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''اور تجھے پتہ ہے، جن لوگوں کی تو نے گردنیں کاٹیں وہ تیرے بچپن کے دوست تھے۔''

اس دفعہ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ بڑھیا کی آواز اونچی ہوتی گئی۔

''اور تجھے پتہ ہے پڑوس کی جس لڑکی کی عزت تو نے اور تیرے ساتھیوں نے درندوں کی طرح لوٹی وہ بچپن میں کبھی کبھی میرا دودھ بھی پی لیتی تھی اور اس رشتے سے وہ تجھے ہمیشہ بھائی کہا کرتی تھی اور تجھے راکھی بھی باندھا کرتی تھی۔ کیا تو اپنے معصوم بچپن کی ہر یاد کو گناہوں کے اندھیرے غار میں دفن کر چکا ہے؟''

آخری جملہ ادا کرتے کرتے بڑھیا کی آواز تھرتھرا گئی اور اس کے سامنے کھڑا استون کی طرح کھڑا ہوا اس کا لڑکا دھم سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ زندگی میں اس سے پہلے اس نے ایسی بے بسی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی نہیں جب بار بار چوری اور غنڈہ گردی کے الزام میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑا تھا۔ اسے اس طرح پسپا ہوتے دیکھ کر اس کی ماں ایک بار پھر گرجی۔

''بول، تو نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تیرے لیے وہ چوریاں اور ڈاکے کافی نہیں تھے جو تو آئے دن کرتا رہتا تھا؟؟ اس میں لٹنے والوں کی کم از کم شکلیں تو اجنبی ہوتی تھیں۔ کیا تیرے پاپی پیٹ کو بھرنے کے لیے وہ کافی نہیں ہیں؟ میں ایک بار پھر تجھ سے پوچھتی ہوں کہ آخر تو نے ایسا کیوں کیا؟؟''

ماں کی باتیں سن کر وہ بپھر اٹھا اور پھر سنبھل سنبھل کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگا۔

''اس لیے کہ میں بھی اپنے بھائی کی طرح ایک فوجی ہوں۔ جس طرح اسے دشمنوں کو مارنے کے لیے سرکار کی طرف سے ڈھیر سارے انعامات ملے تھے اسی طرح مجھے بھی اس کام کے لیے کچھ لوگوں نے بہت سارے پیسے دیے ہیں...... یہ دیکھ۔''

اور اتنا کہہ کر وہ اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر ماں کے آگے ڈھیر کرتا گیا۔

☆☆☆

لامکاں

اس چھوٹے سے گھر میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کو ان لوگوں نے بیڈروم بنا دیا اور دوسرے کو ڈرائنگ روم۔ دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور دونوں ہی کو گھر سجا کر رکھنے کا شوق تھا۔ جب اس چھوٹے سے گھر میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ رکھی جا چکی تو ان دونوں نے ناقدانہ نظروں سے پورے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بیڈروم میں ایک مسہری، ایک سنگار میز اور ایک لوہے کی الماری تھی، الماری کے اوپر ان لوگوں نے کپڑوں کا بکس رکھ دیا تھا۔ اور اسے ایک خوبصورت کپڑے سے ڈھک دیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ سیٹ تھا، اور ڈائننگ ٹیبل رکھا تھا۔ کونے میں رکھا ٹی۔ وی کمرے کی شوبھا کو اور بڑھا رہا تھا۔ اس کے اوپر دیوار سے لگے فریم میں دونوں کی مسکراتی ہوئی تصویریں تھیں۔ دیوار سے لگی ایک الماری بھی تھی جس میں کچھ ناول، چند شعراء کے دیوان اور جنس کے موضوع پر کچھ کتابیں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے لگ جانے کے بعد تو کمرے کی خوبصورتی کچھ اور ہی بڑھ گئی تھی۔ غرض کہ یہ چھوٹا سا مکان ہر طرح سے سیٹ ہو چکا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی جا چکی تھی۔ اور اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ مقدس کتاب جسے عورت اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئی تھی۔ بیڈروم میں تو سوائے الماری کے کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں اسے رکھا جا سکتا تھا اور اس کے اوپر کپڑوں کا بکس رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم میں یا تو اسے ٹی۔ وی کے اوپر رکھا جا سکتا تھا یا پھر کتابوں کی الماری میں لیکن دونوں ہی جگہوں پر اس کی بے حرمتی ہوتی کیونکہ ٹی۔ وی پر تصویریں آتی ہیں اور الماری میں جنسی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دونوں کافی دیر تک سر جوڑے اس مسئلے کا حل

سوچتے رہے۔آخرکار عورت نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہ اسے مسجد میں بھیج دیا جائے۔''

مرد نے کوئی جواب نہ دیا۔اس کے پاس کہنے کو اب رہا ہی کیا تھا۔

☆☆☆

گھروندے

میں اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا تواریخ کا مطالعہ کر رہا تھا۔اس دھرتی کا وجود میں آنا، اس پر زندگی کے آثار پیدا ہونا اس پر ہر قسم کے جانوروں کا نشو ونما پانا، یہ ساری باتیں میرے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا میں ہزارر ہا ہزار سال پرانا کوئی شخص ہوں وہ شخص جس نے سب سے پہلے اس بات کا ادراک کیا کہ وہ دوسرے جانداروں سے برتر ہے، اعلیٰ ہے ارفع ہے۔ گوکہ وہ بھی ایک مشت خاک سے بنا ہے اس کے جسم میں بھی گوشت ہے، ہڈی ہے، خون ہے اور دوسرے جاندوروں کی طرح اس کا بھی ایک دن مرجانا ہے۔اس کے گوشت کو کیڑے چاٹ جاتے ہیں، ہڈیاں سرمہ بن جاتیں ہیں، خون خشک ہوجاتا ہے وہ مرجاتا ہے۔ وہ پھر سے مشت خاک ہوجاتا ہے۔مگر نہیں۔ وہ پھر بھی اعلیٰ ہے کیوں کہ اس کے پاس ایک دماغ ہے جو سوچتا ہے سمجھتا ہے اور اسی سوچ نے اسے اس بات پر مجبور کیا کہ موسموں کی سختیوں اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے ایک محفوظ و مامون جگہ کی ضرورت ہے اور پھر اس نے ایک گھر بنایا۔

میں مطالعہ میں اس قدر مستغرق تھا کہ مجھے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ کب میری بیوی کرسی کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی ہے۔آج کل اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ مسکراتی ہے تو لگتا ہے میرا منھ چڑا رہی ہو۔ وجہ میں جانتا ہوں مگر اس کی اداسی دور کرنے میں ناکام ہوں۔ وہ کہتی ہے۔

''آپ تو دفتر چلے جاتے ہیں اور آپ کے غائبانے میں مالک مکان کی بیوی میرے پاس چلی آتی ہے اور ایک ہی بات بار بار کہتی ہے میرا مکان جلد سے جلد خالی کردیجئے۔''

میں دھیرے سے ہنس دیتا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں؟ مکان خالی کرنا اتنا آسان ہے کیا۔ آدمی اکیلا رہے تو کہیں بھی جا سکتا ہے۔ مگر بیوی اور گھر کے ساز و سامان کو لے کر کہاں چلا جائے۔ پچھلے چھ ماہ سے تلاش کرتے کرتے عاجز آ چکا ہوں۔ کہیں مکان نہیں ملتا۔ ملتا ہے تو رہنے کے قابل نہیں۔

میرا ذہن پھر بھٹک جاتا ہے اس انسان کی طرف جس نے سب سے پہلے گھر کی تعمیر کی۔ پھر کئی گھر بنے، بستیاں بن گئیں۔ لیکن پھر کیا ہوا؟

زلزلے آئے!

طوفان آئے!!!

آندھیاں آئیں!!!

صدیوں کی محنت پل بھر میں خاک میں مل گئی۔ گھر ریت کے گھروندوں کی طرح مٹ گئے۔ مگر یہ جو انسان ہے نا! بڑا سخت جان ہے۔ اس نے پھر کمر باندھی، بستیاں پھر بس گئیں۔

''آخر ہم لوگ کب تک اس طرح ذلیل ہوتے رہیں گے۔'' بیوی کی آواز میری سماعت سے ٹکراتی ہے وہ کہہ رہی ہے۔

''کیوں نہ ہم لوگ اپنا گھر بنالیں۔''

''گھر'' یہ خوشنما لفظ جیسے خواب کا کوئی خوبصورت حصہ یا تپتی زندگی میں خوشی کا ایک پل...... میرے سینے سے ایک سرد آہ نکلتی ہے۔

''گھر کا بنانا کوئی کھیل ہے کیا؟ گھر بنانے میں اور ریت کے گھروندے بنانے میں بہت فرق ہے۔''

میں اپنی بیوی کو بہت کچھ سمجھانا چاہتا ہوں مگر عورت صرف ایک چیز سمجھتی ہے......

اپنی خواہش کی تکمیل۔ وہ بحث کرنے لگتی ہے۔

''آخر یہ جو گھر بن رہے ہیں، شہر چاروں طرف سے پھیل رہا ہے۔ یہ سب آخر انسان ہی تو کرتا ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے۔'' پھر اس کی آواز روہانسی ہو جاتی ہے۔

''آپ کچھ نہیں کر سکتے آپ صرف تخیل میں گھر بنا سکتے ہیں۔ افسانہ نگار ہیں نا!''

میں اسے اپنی پاس بک دکھاتا ہوں اس میں میری جمع پونجی جو چند سو روپیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ زمین، رجسٹری، نقشہ، چونا، ریت، سمنٹ، چھڑ، راج، مزدور؟''

میری بیوی غصے میں پیر پٹکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ بیچاری عورت! میں پھر مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔ کورو اور پانڈوں کی لڑائی، لاکھ کا گھر...... پھر وہی گھر۔''

گھر ہر جگہ موجود ہے، ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر یگ میں...... کیوں کہ گھر انسان کی تیسری اہم ضرورت ہے۔ کتنے گھر بنے، کتنے گھر اجڑے۔ مگر گھر بنتے ہی چلے گئے۔

روم جل رہا ہے۔ نرو بانسری بجا رہا ہے۔ ہیرو وشیما اور ناگاساکی سے صرف دھواں اٹھتا نظر آتا ہے اور آگ کے شعلے ہیں۔ امیریکہ کی برتری ساری دنیا پر قائم ہو جاتی ہے۔ مگر بستیاں پھر بس گئیں ہیں۔

میں اپنے آپ ہی مسکراتا ہوں۔ بسنے اور اجڑنے کی تاریخ میرے سامنے ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ ممکن ہے میری بیوی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے یا نہ ہو، لوگ مرجاتے ہیں۔ میں بھی مر جاؤں گا لیکن مکانات بنتے رہیں گے اور یہ مکان انسان ہی بناتا ہے۔ میں بھی تو ایک انسان ہوں اور انسان کبھی نہیں مرتا۔

☆☆☆

کارجہاں دراز ہے

اخبار میں ایک تصویر چھپی ہے۔میری نگاہیں اس تصویر پر جیسے چپک کر رہ گئی ہیں۔ایک سیاہ فام جسم ہے۔جسم کیا ہے ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے، کپڑوں سے بے نیاز، گھٹنوں میں سر دیے۔ سارے چہرے پر صرف ایک ہی چیز نمایاں ہے اور وہ چیز ہے اس کی آنکھیں، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں کرب ہے، دکھ ہے، جلن ہے، تڑپ ہے آنکھوں سے جھانکتا ہوا ایک سوال۔

آخر ہمارا قصور کیا ہے؟

انسان نے جب اس دنیا پر قدم رکھا تو وہ بالکل غیر محفوظ تھا۔وہ پہاڑوں پر رہتا تھا، جنگلوں میں بسر کرتا تھا، درختوں پر زندگی بسر کرتا تھا جانوروں سے ڈرتا تھا، ان دیکھی وباؤں کا شکار ہوتا تھا لیکن اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔باغ بہشت سے اسے جو حکم سفر ملا تھا اسے وہ حکم یاد تھا۔زمانہ کروٹیں لیتا رہا۔جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔ پرانے پتے جھڑتے رہے، نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ بہار سجاتی رہی، خزاں اجاڑتی رہی۔انسان نے بستیاں بسائیں، جنگیں لڑیں۔ہار جیت ہوتی رہی۔انسان کا وحشیانہ پن دھیرے دھیرے اس سے جدا ہوتا رہا۔مگر نہیں یہ صرف ایک خول تھا اور جب کبھی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ یہ خول توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے روز اول سے اس کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ محض دکھاوا تھا۔انسان آج بھی وہیں ہے جہاں پہلے تھا کیوں کہ اخبار میں جو تصویر چھپی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جو کپڑوں سے بے نیاز ہزار ہا ہزار سال پرانا انسان نظر آتا ہے اس تصویر کے نیچے تحریر ہے۔

”یہ کسی نوعمر لڑکے کی تصویر نہیں ہے بلکہ ایک جوان لڑکی کی تصویر ہے جو بھوک

اور فاقہ کشی کا شکار ہو کر اپنی موت کا انتظار کر رہی ہے۔“

”انتظار“ کتنا پیارا لفظ ہے۔سارے جہاں کا رومان اس ایک لفظ میں سمٹ کر آگیا ہے، اس لفظ کو سنتے ہی ذہن پر ایک ست رنگا پردہ کھنچ جاتا ہے، دروازے کی کوئی چوکھٹ، کوئی ادھ کھلا کواڑ، کھڑکی کا کوئی پٹ اور پٹ کو تھامے ہوئے کوئی حنائی ہاتھ...... چوڑیوں سے سجا، دو آنکھیں ستاروں سی جھلملاتی، کچھ کہی کچھ ان کہی باتوں کی تصویر بنی، کوئی دھڑکن، آئی آہٹ، ہوا کی سرسراہٹ پتوں کے ملنے کی آواز، فضا میں گونجتی ہوئی سرگوشی یا اوپر ستاروں بھرا آسمان، مدھم مدھم چاند، ہوا ساکت، چہار سو خاموشی...... کتنی ہی تصویریں اس ایک لفظ سے وابستہ ہیں مگر اس تصویر کی آنکھوں میں جو انتظار ہے اس میں نہ چاند ہے نہ ستارے، نہ چوڑیوں کی کھنک ہے، نہ ہواؤں کی سرسراہٹ۔ان آنکھوں میں صرف اور صرف ایک چیز نظر آتی ہے اور وہ ہے موت، کسی کیڑے کی مانند دھیرے دھیرے اس کے وجود کو چاروں طرف سے گھیرتی ہوئی اپنے شکنجہ میں جکڑتی ہوئی، قطرہ قطرہ موت۔

ایک بڑا طوفان آیا دریا، پہاڑ پیڑ پودے، چرند پرند مکان دکان سب ڈوب گئے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا، تا حد نظر اور تا حد خیال۔سب کچھ ختم ہو گیا، فنا ہو گیا۔صرف ایک کشتی اس طوفان میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ مٹھی بھر انسان بچے تھے۔وہ جو خدا پر یقین رکھتے تھے اور خدا باقی تھا وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اس کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔پران خلیے ٹوٹتے جاتے ہیں نئے خلیوں کی تعمیر نہیں ہوتی جسم کی دیوار ڈھنے لگتی ہے اور پھر یہ عمارت ایک دن زمین بوس ہو جاتی ہے۔

انسان مر جاتا ہے یا پھر کوئی بیماری اسے دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے دماغ میں ٹیومر ہو جاتا ہے وہ بھی موت کا انتظار کرتا ہے، مگر وہ انتظار ویسا نہیں

جیسا ان جلتی آنکھوں میں ہے۔ایک انسان سینی ٹوریم کے بیڈ پر لیٹا جلتی آنکھوں سے موت کا انتظار کررہا ہے۔صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔سینی ٹوریم کے باہر رات کے سائے پر پھیلاتے ہیں اور وہ اس اندھیرے میں اپنی موت کو تلاش کرتا ہے مگر وہ صرف اکیلا اس موت کا منتظر ہے۔

موت تیرے کتنے روپ؟ اجتماعی......انفرادی۔ایک شخص مرجاتا ہے۔جسم اور روح کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔روح پرواز کر جاتی ہے۔جسم رہ جاتا ہے......سڑ جاتا ہے......گل جاتا ہے۔خمیر اپنی خاک میں مل جاتا ہے۔سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے۔صرف ایک ہستی ہمارے درمیان سے اُٹھ جاتی ہے۔

یا پھر اجتماعی موت......جو ہزار ہا سال سے انسانوں پر فتح حاصل کرتی آرہی ہے۔

آج بھی کبھی تقسیم کی شکل میں رونما ہوتی ہے......کبھی بنگلہ دیش کا نام اپناتی ہے......کبھی ایران اور عراق کا نام اُچھالتی ہے......کبھی افغانستان تو کبھی فلسطین کو اپنا گہوارا بناتی ہے۔کبھی خالصتان کا نعرہ لگاتی ہے تو کبھی آزاد کشمیر کا۔اور کبھی بمبئی، جمشید پور، رانچی، میرٹھ، بہار شریف، بھبھونڈی، علی گڈھ اور نہ جانے کتنے شہروں پر پنجہ گاڑتی ہے۔اتنی مختلف شکلوں میں ہونے کے باوجود اس میں ایک قدر مشترک ہے۔روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔کوئی ان دیکھا ہاتھ اپنا کام انجام دیتا ہے۔مگر یہ کیسی موت ہے؟ اپنا انتظار کرواتی ہوئی موت......بھوک کی شکل میں ڈراتی ہوئی موت......میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

’’اُٹھئے، سو گئے کیا؟ چلیے کھانا لگ گیا ہے۔‘‘ بیوی کی آواز سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ڈائننگ ٹیبل پر کھانا سجا ہے مگر اسے دیکھ کر مجھے بھوک کا احساس نہیں ہو رہا ہے مگر بادل نخواستہ اُٹھنا ہی پڑتا ہے۔میں دھیرے لقمہ بناتا ہوں اور بڑی بے دلی کے ساتھ اسے منھ کے تابوت میں رکھ کر پیٹ کی گہرائیوں میں دفن کر دیتا ہوں......ویسے ہی جیسے لوگ کسی مردے کو

دفن کرتے ہیں۔میری بیوی میرا چہرہ غور سے دیکھتی ہے۔اس کے چہرے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور وہ چڑ کر بول اُٹھتی ہے۔

’’کیا ہو گیا ہے آجکل آپ کو؟ کھانا بالکل نہیں کھاتے ہیں۔کیا میرے ہاتھوں کا بنا کھانا آپ کو اچھا نہیں لگتا؟‘‘

میں اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لیتا ہوں۔

’’نہیں میری جان! کھانا تو بہت مزیدار بناتی ہو تم۔مگر میں کیا کروں، مجھے آجکل بھوک ہی نہیں لگتی۔‘‘

’’بھوک کیوں نہیں لگتی؟ علاج کروائیے اپنا۔دیکھئے تو بدن کیسا سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔‘‘

میں اپنے فربہ جسم پر ایک نظر ڈالتا ہوں اور دل ہی دل میں ہنس دیتا ہوں۔میری نظر پھر ڈائننگ ٹیبل پر سجے کھانے پر جا ٹکتی ہے۔یہ چاول، دال، سبزیاں جو زمین کا سینہ چیر کر باہر آتی ہیں کتنی طاقت ور ہیں۔ان چیزوں نے انقلاب روس برپا کر دیا۔زار کی حکومت ختم ہو گئی۔روٹی مانگنے پر کیک کھانے کا مشورہ دینے والے ختم ہو گئے۔انسان نے مزید ترقی کر لی۔وہ مہذب ہوتا گیا۔عالمی امن کی باتیں کرنے لگا۔دو جنگ عظیم جھیلنے کے بعد وہ موت سے نبرد آزما ہو گیا۔انسانی زندگی کی قیمت کی باتیں ہونے لگیں۔مگر انسان کے پیٹ میں جو جنگ جاری ہے اس کے لیے کوئی ’’یو۔این۔او‘‘ قائم نہیں ہوتا کیونکہ وہ انسان جو چاند پر کمند ڈالتا ہے، ستاروں سے آگے کے جہانوں کی تلاش کرتا ہے، سو برس آگے کی باتیں کرتا ہے، وہ تنگ نظر بھی ہے اور تنگ دل بھی۔کیونکہ وہ سفید فام ہے۔اور یہ آنکھیں......موت کا انتظار کرتی ہوئی آنکھیں ایک سیاہ فام کی ہیں۔

☆☆☆

ہتیا

اپنے پانچ سالہ بچے وکرم کو ہم ابھی تک پیار میں وکی کہتے ہیں، حالانکہ وکی میں بچوں جیسی کوئی بات نہیں ہے...... نہ رونا، نہ ضد کرنا، نہ توڑ پھوڑ کرنا اور نہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا۔ اس چھوٹے سے بچے کے یہ انداز دیکھ کر مجھے کبھی کبھی ڈر سا لگتا ہے۔

صبح کو اٹھتے ہی وکی اسکول جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے اور اسکول بس کا ہارن سنتے ہی میرے گال پر ایک ہلکا سا پیار ثبت کر کے ہاتھ ہلاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ میری پڑوسن کہتی ہے کہ جب تک اس کے بچے گھر پر رہتے ہیں اس کی ناک میں دم رہتا ہے اور جب وہ اسکول چلے جاتے ہیں تو گویا سارے گھر پر سکون سا چھا جاتا ہے، مگر وکی تو عجیب لڑکا ہے۔ وہ جب گھر پر ہوتا ہے، تو بھی سکون ہی سکون رہتا ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ کاش میرا معصوم وکی کبھی کوئی کراکری توڑ ڈالے...... غلطی سے ہی سہی یا پھر اپنی کتابیں پھاڑ ڈالے اور میں اسے خوب ڈانٹوں ڈپٹوں مگر ایسا موقع آتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو اپنی چیزیں اتنے سلیقے سے رکھتا ہے کہ مجھے اس پر رشک آنے لگتا ہے۔ میں اپنے بچے کا موازنہ جب اپنے شوہر سے کرتی ہوں تو دونوں میں بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ وکی جتنا سنجیدہ اور متین ہے، میرے شوہر اسی قدر لاابالی ہیں۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا......بس یہی ان کی فطرت ہے۔ ہاں ان پر کبھی سنجیدگی طاری بھی ہوتی ہے تو صرف یہ سوچ کر کہ آخر اتنا چھوٹا سا بچہ اتنا سنجیدہ کیوں کر ہے یا پھر اس وقت جب وہ ریڈیو پر خبریں سنتے ہوتے ہیں۔ خود مجھے خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن

جب وہ خبریں سننے کے لیے ریڈیو آن کرتے ہیں تو وکی بھی چپکے سے ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی معصوم آنکھیں ریڈیو پر جمائے پتہ نہیں کیا کیا سنتا رہتا ہے۔

ایک رات بستر پر لیٹے لیٹے اچانک وہ میری طرف مڑا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر دھیرے سے بولا۔

''ممی! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو بیٹے!''

''ممی! دنگا کسے کہتے ہیں؟''

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ یہ لفظ وہ کہاں سے سیکھ گیا۔ اس معصوم بچے کو دنگے فساد سے کیا مطلب؟ میں اس رات کافی دیر تک سو نہیں سکی۔

پھر ایک اتوار کو جب میرے شوہر اپنے دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تاش کے پتوں میں الجھے ہوئے تھے، وکی چپکے سے میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس نے پوچھا۔

''ممی! ہتیا کسے کہتے ہیں؟''

''بیٹے! کسی کو جان سے مار دینے کو ہتیا کہتے ہیں۔''

اس نے خاموشی سے میرا جواب سنا اور پھر کتاب پر نظریں جمائے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبداتا ہوا چلا گیا۔

ادھر چند دنوں سے میرے شوہر خبریں کچھ زیادہ توجہ سے سننے لگے تھے۔ ان کے ساتھ وکی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''ممی!'' آپ کو معلوم ہے آدمی کی ہتیا کرتا ہے۔''

‘‘تمہیں کس نے بتایا؟ میں چونک کر پوچھ بیٹھی۔

ریڈیو پر نیوز آ رہی تھی کہ بہت سے لوگوں کی ہتیا کر دی گئی ہے۔ کیوں ممی لوگ دوسروں کی ہتیا کیوں کرتے ہیں؟’’

میں اس کا سوال سن کر پریشان ہو اٹھی۔ میں اس بچے کو کیا سمجھاتی؟ اس کے کچے ذہن میں ابھی سے ایسے خطرناک الفاظ کیوں ڈیرا جمانے لگے تھے؟ میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔

‘‘بیٹے، جاؤ کھیلو جا کر۔’’

‘‘نہیں ممی! بتائیے نا...... وہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔’’ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار ضد کی تھی اس لیے مجھے خوشی سی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

‘‘بیٹے! جب تم بڑے ہو جاؤ گے نا تو خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ جاؤ، اب جا کر کھیلو۔’’

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور میں خود بھی کچھ پریشانی سی محسوس کرنے لگی۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھ گویا کہہ رہا ہو...... ‘‘ٹھیک ہے ممی! آپ مت بتائیے۔ میں خود معلوم کر لوں گا۔’’

اس سے اگلے ہی روز میرے شوہر کے ایک گہرے دوست اپنی سروس جوائن کرنے کے لیے آ گئے اور ہمارے ہی گھر میں ٹھہرے۔ آج کل شہروں میں ہر چیز مل جاتی ہے مگر مکان کا ملنا دیوانے کا خواب ہی ہے۔ ویسے بھی ہمارا گھر کافی بڑا ہے اور اس میں دو خاندان بڑے آرام سے رہ سکتے ہیں لہذا ہم لوگوں نے انیل کو ایک حصہ رہنے کو دے دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کو بھی لے آئے۔ میں پنکی اور پپو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سوچا، چلو اب میرے وکی کا دل ان بچوں کے ساتھ بہلے گا۔ مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ وکی نہ تو ان بچوں کے پاس جاتا اور نہ ان کے ساتھ کھیلتا بلکہ اب تو وہ اور بھی چپ چپ رہنے لگا تھا۔ ہر وقت نہ جانے

کیا کیا سوچتا رہتا۔ مجھے یہ احساس ہوتا کہ اب وہ بہت سے الفاظ کا مفہوم بھی سمجھنے لگا ہے شاید اسی لیے اب وہ مجھ سے سوالات کم کرنے لگا تھا۔

آج شام کو میں کچن میں کام کر رہی تھی کہ وکی چپکے سے آیا اور میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی جب میں مڑی تو اس کی انکھوں پر نظر پڑتے ہی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔

‘‘کیا بات ہے بیٹے؟’’ میں نے پیار سے پوچھا۔

‘‘ممی! کیا یہ انیل انکل اب یہیں رہیں گے؟’’

‘‘ہاں بیٹے!’’

‘‘اور آنٹی اور پنکی، پپو بھی؟’’

‘‘ہاں، مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟’’

‘‘ممی! مگر یہ گھر تو ہم لوگوں کا ہے نا؟’’

‘‘ہاں۔’’ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر میرے کان کے قریب اپنا منہ لا کر دھیرے سے بولا۔

‘‘ممی ان سب کی ہتیا کر دو۔ نہیں تو یہ ہمارے گھر پر قبضہ کر لیں گے۔’’

ایسا کہتے وقت وکی کی آنکھیں بڑی معصوم دکھائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

نروان

وہ دروازے کی چوکھٹ سے لگی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی اور جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور اب تک اس کے شوہر کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں سڑک پر پھسلتی ہوئی دور تک جاتیں اور پھر ناکام ہو کر لوٹ آتیں۔ اس نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے پچکے ہوئے پیٹ کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔

''ہے بھگوان! اگر ان کے آنے سے پہلے پنکی اسکول سے لوٹ آئی تو کیا ہوگا؟'' وہ من ہی من بدبدائی اور پھر اس کی نگاہوں میں ٹھنڈا چولہا گھوم گیا۔ پنکی اسکی سات سالہ بچی کا نام تھا۔ جس وقت وہ پیدا ہوئی تھی اس وقت وہ کتنی خوبصورت تھی، بھولی بھالی سی گل گوتھنا جیسی اور اس کے گال سرخ گلابوں کی طرح تھے اسی لیے تو ان دونوں نے اس کا نام پنکی رکھ دیا تھا مگر اب بھوک کے دیو نے اس کی ساری کشش کھینچ لی تھی۔ دھنسے ہوئے گالوں اور سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ کبھی کبھی اسے اپنے شوہر پر غصہ بھی آتا مگر اس کا اپاہج شوہر کر بھی کیا سکتا تھا۔ یوں تو اس کے ہاتھ پیر سلامت تھے مگر بے چارا ذہنی طور پر اپاہج ہو چکا تھا۔ اسے وہ وقت یاد آتا جب اس کا شوہر شادی سے پہلے ایک گیراج میں کام کرتا تھا اور وہ خود اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ ہر وقت پان چباتا رہتا اور مسکراتا رہتا تھا۔ سانولا سا ہنس مکھ نوجوان آتے جاتے اسے چھیڑتا رہتا۔ شروع شروع میں تو اسے بہت غصہ آیا پھر دھیرے دھیرے یہ غصہ پیار میں تبدیل ہو گیا اور دونوں چوری چھپے ملنے لگے۔ جوانی کا یہ اصول ہے کہ اس کی جس قدر کڑی نگرانی کی جاتی ہے وہ اسی قدر سرکشی دکھلاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ لاکھ غریب سہی مگر ایک ایسے لڑکے

سے کبھی اس کی شادی نہیں کریں گے جو گیراج میں نوکر ہو اور جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہو اور پھر شنکر پڑھا لکھا بھی نہیں تھا، لہٰذا دونوں نے چھپ کر شادی رچالی۔ سرکار نے بالغ نوجوانوں کو اتنا حق تو ضرور دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا جیون ساتھی چن لیں۔ شنکر کا دنیا میں تو کوئی تھا ہی نہیں اور شادی کے بعد وہ بھی اپنے گھر والوں کے لیے مر چکی تھی مگر وہ دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے۔ جوانی کا جوار بھاٹا چڑھاؤ پر تھا۔ ایسے میں آگے پیچھے کی کوئی سدھ نہیں رہتی ہے۔ دونوں بے حد خوش تھے۔ ایک سال ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ اور پھر پنکی نے تو ان کے پیار کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ مگر اسی زمانے میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے ان دونوں کے ہنستے کھیلتے گھر میں آگ لگا دی۔ شنکر کو اپنے مالک سے جھگڑا ہو گیا۔، اس نے جوانی کے جوش میں آکر اپنے مالک پر ہاتھ اٹھا دیا۔ گیراج کے مالک نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پولیس آئی اور شنکر پر چوری اور مار پیٹ کے الزامات عائد کر کے اسے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

شنکر جب چھ ماہ کی جیل کاٹ کر آیا تو دنیا اس کے لیے بدل چکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ سا گیا تھا۔ کوئی گیراج والا اسے کام دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ دن بھر نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور شام کو تھکا ہارا لوٹ آتا۔ کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ خودکشی کر لے، مگر اسے زندہ رہنا تھا...... پارو اور پنکی کے لیے۔ وہ دن بہ دن سوکھتا چلا گیا۔ آخر کار اندھیرے میں امید کی ایک کرن جھلملائی۔ اس کا دوست گوپی اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ پارو کو گوپی سے نفرت تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا ایسا لگتا جیسے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے پی جانا چاہتا ہو۔ گوپی نے اسے کچھ روپے قرض دیئے تاکہ وہ فٹ پاتھ پر چائے کی دوکان کھول لے۔ مگر قسمت اب تک ان سے خفا تھی۔ ابھی اسے چائے کی دکان کھولے چند ہی روز ہوئے تھے کہ شہر کے سبھی فٹ پاتھوں کو صاف کیا جانے لگا۔ پولس والوں نے شنکر کی دکان گرا دی۔ وہ بد

حواس ہو گیا تھا۔اب اس کے پاس نہ تو اتنے پیسے سے کہ وہ پھر دکان کھول سکے اور نہ ہی گوپی کا قرض اتارنے کے لیے کچھ تھا۔گوپی روز تقاضہ کرنے کے بہانے اس کے گھر پہنچ جاتا۔اور پھر ایک دن شنکر نے اس سے ایک ایسی بات کہی کہ وہ چونک اٹھی۔وہ غم اور حیرت کی تصویر بنی ایک ٹک اپنی شوہر کا منھ دیکھتی رہی۔اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکی۔رہ رہ کر اسے یہی خیال آتا کہ آخر شنکر نے یہ سب کچھ کیسے کہہ دیا۔دوسرے دن اس نے شنکر کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’’تم سے کوئی کام نہیں ہوتا تو گھر بیٹھو۔میں پڑھی لکھی ہوں، چار پیسے کما سکتی ہوں، تم دونوں کا پیٹ پال سکتی ہوں۔‘‘

اور پھر اسے نوکری مل گئی، کیوں کہ وہ جوان بھی تھی اور خوبصورت بھی۔مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ جوان اور بے سہارا عورت کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔اسے ہر جگہ ہوس ناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا اور پھر ایک دن وہ بھی ہو گیا جس سے وہ اب تک ڈرتی آئی تھی۔اس کی عزت لوٹ لی گئی، اور تب اس نے ایک نیا فیصلہ کیا۔جب عزت ہی گنوانی ہے تو بھر شوہر کو کیوں ناراض کیا جائے۔اس نے جب شنکر کو اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ کچھ نہیں بولا۔بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔وہ سمجھی شاید اسے یہ بات بری لگی ہو لیکن جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا۔اور اس طرح پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اسے ہر روز ایک نئے جہنم سے گزرنا پڑتا۔وہ دن بدن کمزور ہوتی گئی۔،اس کی آنکھیں جو کبھی ہیرے کی کنی جیسی چمکتی تھیں بجھ کر رہ گئیں۔پنکی جو ہر وقت ہنستی رہتی تھی، چپ چپ سی رہنے لگی۔اسے ایک پبلک اسکول میں داخل کرا دیا گیا حالاں کہ پارو نہیں چاہتی تھی کہ پنکی تعلیم حاصل کرے کیوں کہ پڑھ لکھ کر بھی وہ وہی کام کر رہی تھی جسے بغیر پڑھے لکھے بھی کیا جا سکتا تھا۔لیکن پنکی کی موجودگی میں وہ کسی غیر شخص کو اپنے گھر نہیں بلانا چاہتے تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ پنکی کو اس

بات کی بھنک بھی ملے اور اس کا معصوم ذہن کوئی بری بات قبول کرے۔لہذا پنکی اسکول میں داخل کر دی گئی۔جس دن پنکی کی چھٹی ہوتی اس دن پارو کو بھی آرام ملتا۔اتنی احتیاط کے باوجود ایک دن پنکی وقت سے پہلے آ گئی تھی۔اس دن کسی نیتا کی موت ہو گئی تھی اور اسکول میں فوراً چھٹی کر دی گئی تھی۔پنکی گھر پہنچی تو شنکر آنگن میں چارپائی پر لیٹا دھوپ سینک رہا تھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔شنکر گھبرا گیا۔پنکی نے ایک نظر بند دروازے پر ڈالی اور پھر اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے جیسے کوئی سوال ہونٹوں پر آ کر ٹوٹ گیا ہو۔اس سے پہلے کہ شنکر کچھ کہتا بند کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک اجنبی شخص برآمد ہوا۔ایک چھوٹی بچی کو دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹھکا، پھر مسکراتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔پنکی اس شخص کو حیرت سے تک رہی تھی۔

’’پتاجی یہ کون ہیں؟‘‘ اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

’’بیٹی! یہ تمہارے انکل ہیں۔پرنام کرو انہیں۔‘‘ اور پنکی دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا۔اس شخص نے کچھ روپئے نکالے اور اس کے ہاتھ میں تھما کر دھیرے سے اس کے گال میں اس کی چٹکی لی۔

اس نے غصے میں روپئے زمین پر پھینک دئے مگر شنکر نے لپک کر انہیں اٹھا لیا اور پنکی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

’’بے شرم انہوں نے اتنے پیار سے تمہیں روپئے دئے اور تو نے انہیں زمین پر پھینک دیا۔معافی مانگ ان سے۔‘‘ مگر پنکی غصہ میں پیر پٹکتی ہوئی اندر کمرے میں داخل ہو گئی جہاں پارو گم سم کھڑی تھی۔

اس واقعہ کے بعد یہ دونوں اور زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔اب جب کبھی بھی کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوتا، شنکر سڑک پر نظریں جمائے رہتا کہ اگر پنکی آ رہی ہو تو وہ انہیں خبردار کر

سکے مگراس کے بعد سے ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

پاروکا بدن دن بدن ڈھلتا جارہا تھااوراسی حساب سے آمدنی بھی کم ہونے لگی تھی۔ آج تو ہر جگہ کمپٹیشن ہے۔ جب لوگوں کو سستے داموں میں اچھا اور تازہ گوشت میسر ہو جائے تو پھر باسی اور ڈھیلے گوشت کو کون پوچھتا ہے۔اب کبھی کبھی ایسا ہونے لگا کہ دوتین دن تک کوئی نہیں آتا پھر بھی گذر بسر تو ہو ہی رہی تھی۔ جوشخص پنکی کے گال کی چٹکی لینے کے چند روپے خرچ کرسکتا تھا وہ اسے پوری طرح نچوڑنے اور بھنبھوڑنے کے بعد بھی چند روپئے دینے میں آنا کانی کرتا،اوراب تو وہ چند روپئے بھی میسر نہیں تھے۔

پھرایک ہفتہ سے کوئی راہ نہیں بھولا تھا۔آج تو گھر میں ایک چٹکی آٹا بھی نہیں بچا تھا۔ پنکی اسکول سے بھوکی آئے گی اور آتے ہی کھانا مانگے گی۔اسے وہ کیا کھلائے گی؟ وہ سوچتی رہی اوراس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

شام ہوگئی، مگر شنکر نہیں آیا۔اسے دور سے پنکی آتی دکھائی دی اوراس کا دل اندر ہی بیٹھ گیا۔اس کی بجھی بجھی آنکھیں چھلک آئیں۔پنکی نے قریب آتے ہی کہا۔

’’ماں جلدی سے کھانا دو، بہت بھوک لگی ہے۔‘‘ اس سے کچھ بولا نہیں گیا، وہ سوچتی رہی کہ پنکی کو کیا جواب دے۔آخراس نے پھنسی پھنسی آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔

’’بیٹی! آج گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘ چونک کر مڑی اور بے ساختہ بول اٹھی۔

’’کیوں،آج کوئی انکل نہیں آئے کیا؟‘‘

☆☆☆

ٹھاکر کا کنواں

(پریم چند کی روح سے معذرت کے ساتھ)

اب نہ ٹھاکراس دنیا میں موجود ہے نہ ہی پریم چند، دونوں پرلوک سدھار گئے، اب میری فکر کرنے والا کوئی نہیں رہا، میری اہمیت ختم ہو چکی ہے میں جو کبھی گاؤں والوں کو صاف شفاف، جھل جھل کرتا ہوا پانی مہیا کرتا تھا، کب کا سوکھ چکا ہوں۔گاؤں والے مجھے بھول چکے ہیں لیکن میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔میرے ہی پانی سے پنڈت جی صبح صبح اشنان کیا کرتے تھےاور اشلوک پڑھتے ہوئے آتی جاتی عورتوں کو تاکا کرتے تھے۔میرے ہی سامنے وہ اپنے گھر میں جوا کھلانے کے جرم میں گرفتار ہوئے تھے اور پھر میری ہی نگاہوں کے آگے ٹھاکر نے معاملہ پٹا دیا تھا۔تھانیدار کو’’ٹھیک‘‘ کرلیا گیا تھا،اور پنڈت جی کواپنے گھر میں جوا کھلانے کی چھوٹ مل گئی تھی اور میری ہی کوکھ سے پانی کھینچنے جرم میں ایک ہریجن عورت کے پیچھے پورا گاؤں پڑ گیا تھا۔

مگراب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔گاؤں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔فیملی پلاننگ والے آتے ہیں اور بچوں کی باڑھ کوروکنے کی ناکام کوشش کر کے چلے جاتے ہیں۔گاؤں میں جگہ جگہ جوئے بازی ہوتی ہے۔مگر تھانیدار پولس چوکی کے آگے کھاٹ بچھا کر سپاہیوں سے ٹانگیں دبواتا رہتا ہے۔اسےاس کا حصہ پابندی سے مل جایا کرتا ہے۔گاؤں کی ظاہری حالت بھی بدل چکی ہے۔سڑکیں پختہ ہوگئی ہیں۔، کوے بجلی کے کھمبوں اور تاروں پر بیٹھ کر گاؤں کی ترقی کا اعلان کیا کرتے ہیں اب گاؤں میں کئی ٹیوب ویل لگ چکے ہیں جن پر پانی بھرنے کے لیے کسی ذات کی تخصیص نہیں۔گندے نالے کا پانی پینا اب خواب وخیال ہو چکا ہےاور یہ سب کچھ

پچھلے ایک برس میں ہوا ہے۔

سردی ختم ہوئی ، بسنت پنچمی کا تیوہار آ گیا اور گذر گیا۔سورج دھیرے دھیرے تپنے لگا۔پھر برسات کا موسم آیا اور کھیتوں میں فصل اگانے کا وقت آ گیا لیکن بارش کا دیوتا لوگوں سے روٹھا ہوا ہے۔مگر گاؤں والوں کو اب اس کی کیا فکر۔اب انھیں کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے کنویں اور رہٹ کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔جگہ جگہ بورنگ ویل بن چکے ہیں ،مگر یہ بورنگ ویل تو بے جان ہیں۔ان میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے بجلی کی ضرورت ہوتی ہے اور بجلی دن رات آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے،اس کے آنے اور جانے کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔کبھی دن دن بھر غائب رہتی ہے۔ کسانوں کا سارا دھیان بجلی کی طرف لگا رہتا ہے۔بجلی کے کھمبے سے لٹکا ہوا بلب شیو کی آنکھوں کی طرح نظر آتا ہے۔اس کے روشن ہوتے ہی کسان اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر دوڑ پڑتے ہیں۔

پھر کئی دنوں تک بجلی نہیں آئی۔معلوم ہوا کہ اس علاقے کا ٹرانسفارمر خراب ہو گیا ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد بجلی کے کارکن آئے اور ٹرانسفارمر کھول کر لے گئے۔ادھر آسمان بادلوں سے خالی تھا۔اخباروں میں سوکھے کی خبریں آنے لگیں۔میرے قریب گاؤں کے بڑے بوڑھے جمع ہوتے اور حالات پر تبصرہ کرتے رہتے۔مجھے معلوم ہوا کہ ریاستی کابینہ میں سوکھے کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور مرکز سے مدد مانگنے کی تجویز پاس ہوئی ہے۔اب گاؤں والوں کی زندگیاں ٹیوب ویل سے وابستہ ہو گئیں۔دن بھر وہاں بھیڑ رہتی۔گھڑے سے گھڑا ٹکراتا ،آدمی سے آدمی ٹکراتا۔کبھی لاٹھی نکل آتی۔لیکن کام کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا ہے۔

اس دن گاؤں میں بہت چہل پہل تھی۔، وزیر اعظم سوکھے کا معائنہ کرنے ریاست میں آئے ہوئے تھے۔وہ گاؤں گاؤں گھومے،غریبوں سے ملے،ان کا دکھ درد دریافت کیا۔ میرے علاقے کا روایتی لباس زیب تن کیا۔غریبوں کے ساتھ ہنسے بولے۔گاؤں والے بے

حد خوش تھے۔، وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ وہ سوکھے کی عورت حال سے نپٹنے کے لیے کئی لاکھ روپئے کی امداد ریاست کو دیں گے۔

گاؤں کے ایک ایک کر کے سارے ٹیوب ویل خراب ہو گئے۔لوگ پانی کو ترسنے لگے۔ پانی جو سمندروں میں بھرا ہے، دریاؤں میں ابلتا ہے پہاڑوں پر برف کی شکل جمع رہتا ہے، آسمانوں میں بادلوں کی شکل میں گھومتا پھرتا ہے......وہ پانی پیاسے انسانوں کی دسترس سے بہت دور تھا۔ وزیر اعظم کے جانے کئی روز کے بعد شہر سے پانی کا ایک بڑا ٹینکر آیا جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا،''جل ہی جیون ہے'' اور اس جیون کو پراپت کرنے کے لیے گاؤں والے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ٹینکروں کی ٹونٹی سے نکلتی ہوئی دھار کو دیکھ کر ان کے سوکھے ہونٹوں پر آسودگی کی لہر دوڑ گئی۔گو کہ ان کی ضروریات پوری نہیں ہوئی تھیں لیکن یہ کیا کم تھا کہ وہ پیاسے مرنے سے بچ گئے تھے۔

میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ان پچاس برسوں میں اس گاؤں نے کیا ترقی کی۔یہ بے جان بجلی کے کھمبے اور ان پر لٹکی ہوئی مردہ تاریں......جگہ جگہ زمین کے سینے پر اُگ آئے ٹیوب ویل جنھیں چلانے پر صرف ہوا نکلتی ہے۔میں سوچ رہا ہوں۔

کاش! میں آج بھی پانی سے بھرا ہوتا،کم از کم پنڈت جی کو اشنان کرنے کے لیے اور گاؤں کی اعلیٰ جاتی کے لوگوں کے پینے کے لیے پانی تو فراہم کرتا۔اب تو چھوا چھوت بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔گاندھی جی نے جو پودا لگایا تھا اب وہ پھل دینے لگا ہے۔شاید گاؤں کے اچھوت بھی مجھ سے فائدہ اٹھانے لگتے۔لیکن میں مجبور ہوں۔میرا خزانہ خالی ہو چکا ہے اور میں تہی دست اور تنگ داماں ہوں۔اب کبھی کوئی لڑکا میری منڈیر پر بیٹھ کر کوئی پتھر میری کوکھ میں گراتا ہے تو میں خالی پیٹ کی طرح بج اٹھتا ہوں۔اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔سوائے اس کے کہ سب کچھ دیکھتا رہوں،سنتا رہوں۔

کئی دن بیت چکے ہیں لیکن وہ نہ وہ ٹینکر دوبارہ آیا، نہ ہی ٹرانسفارمر درست ہوا ہے۔ ٹیوب ویل اب تک بیکار پڑے ہیں۔اب گاؤں کا ہر شخص چارکوس دور گندے نالے کا پانی لانے کے لیے کمر بستہ ہوگیا ہے......اسی گندے نالے سے جس سے پہلے صرف اچھوت پانی لانے جاتے تھے۔کم ازکم وہ زندہ تو رہیں گے۔

کاش !میرے پاؤں ہوتے تو میں خود چل کر دیکھ آتا کہ سرکار نے جو مدد بھیجی تھی وہ اپنی منزل کا نشان کہاں کھو بیٹھی؟

☆☆☆

کھوئے ہوئے سال

تیز بہتی ہوئی ہوا یکایک جیسے دھیمی ہوگئی تھی۔ پانی کی اُٹھتی ہوئی لہریں بھی کچھ دھیمی ہوگئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی بھی کچھ دھیمی ہوگئی تھی۔ایسے میں جھریوں بھرے چہرے اور سفید بالوں والے بوڑھے نے پاس بیٹھی ،آنکھوں پر عینک لگائے اپنے ہی جیسی بوڑھی عورت سے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تمہیں یاد ہے......کبھی ہم یہاں بیٹھا کرتے تھے؟''

''ہاں، یاد ہے۔''اس بوڑھی عورت نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اور ہوا یوں ہی چلتی تھی۔''

''ہاں، یوں ہی چلتی تھی۔''

''اور پانی یوں ہی بہتا تھا۔''

''ہاں، یوں ہی بہتا تھا۔''

''سب کچھ ویسا ہی ہے......صرف ہم بدل گئے ہیں......اور......''

''اور کیا؟''بوڑھی عورت نے عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے سے حیران نگاہیں اُٹھا کر پوچھا۔بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا......کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا......انگلیوں میں پڑی بیش قیمت انگوٹھیوں کو جنبش دی اور پھر پوچھ بیٹھا۔

''ہم کتنے عرصے کے بعد مل رہے ہیں؟''

''یہی کوئی پچاس سال بعد۔''عورت نے گویا ان پچاس برسوں کی طوالت کو ہونٹوں

میں چھپی کراہ میں سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''اُف...... پچاس برس......اور تم بوڑھی ہوگئیں؟''

''تمہارے بال بھی تو سفید ہوگئے اور گالوں پر جھرّیاں بھی پڑ گئیں۔ پچاس برس کم نہیں ہوتے۔''

''ہاں...... پچاس برس کم نہیں ہوتے۔''

بوڑھے نے نگاہیں اُٹھائیں اور آدھی صدی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ایک اٹھارہ سالہ نوجوان پانی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھا چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی میں پھینک رہا تھا۔لہریں بنتیں اور بگڑتیں اور لڑکا ان بنتی بگڑتی لہروں کو گننے لگتا۔سامنے بیٹھی سولہ سالہ دبلی پتلی سی لڑکی چپ چاپ بیٹھی اسے تک رہی تھی۔اس کی اُداس آنکھیں ستاروں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں۔

بالآخر لڑکے نے سکوت توڑا۔

''آج پھر کہیں سے تمہارا رشتہ آیا تھا؟''

''ہاں......کوئی سرکاری آفیسر ہے۔''لڑکی نے اُداس لہجے میں کہا۔

''اور میں نے ابھی تک اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔''لڑکے کا لہجہ تلخ تھا۔

''تو کیا ہوا؟ میں تم سے پیار جو کرتی ہوں۔''

''اور میں ایک معمولی باپ کا بیٹا ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ مجھے تم سے پیار جو ہے۔''

''لیکن میرا کوئی مستقبل نہیں ہے اور تم ایک امیر باپ کی اکلوتی اولاد ہو۔''

''کہا نا......! میں تم سے پیار کرتی ہوں۔''لڑکی نے جھنجھلا کر کہا اور لڑکا ہنس پڑا۔

''ہاں......! یہی تو ہمارا قصور ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کل تم رو کیوں رہے تھے؟''

میں......؟ نہیں تو......''لڑکا ہچکچایا۔

''جھوٹ مت بولو۔یاسمین کہہ رہی تھی۔''

''اس نے جھوٹ کہا ہوگا۔''

''نہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتی......تمہاری طرح......آخر کو تمہاری بہن ہے۔''

''مگر تم بھی تو کل روئی تھیں۔''لڑکے نے اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو......یہ تمہیں کس نے بتایا؟''

''یاسمین نے۔''لڑکے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

اور لڑکی چپ ہوگئی۔

پھر خاموشی چھا گئی اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ خاموشی گہری ہوتی گئی اور شام بھی گہری ہوتی گئی۔اچانک لڑکی نے خاموشی کی اس دبیز چادر کو چاک کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل کہیں گھومنے چلو گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''یہ اتنا چھوٹا سا شہر ہے۔ہم جہاں بھی ساتھ نکلتے ہیں لوگ گھورنے لگتے ہیں۔کہیں کوئی جان پہچان والا مل گیا تو......؟''

''ڈرپوک کہیں کے!''لڑکی نے چڑانے کے انداز میں کہا اور لڑکے نے کھسیا کر ایک کنکری پانی میں پھینک دی۔

پانی میں کنکری گرنے کی آواز آئی اور بوڑھا چونک کر حال میں آ گیا۔اس کی پلکوں کے گوشے بھیگ چکے تھے اور وہ رومال نکال کر اپنی آنکھوں کے کنارے خشک کرنے لگا۔بوڑھی عورت نے اس سے کچھ نہیں کہا......بس اس نے بھی سر اُٹھایا اور پچاس بہاروں کو سمیٹ کر اس پار نگاہ ڈالی۔

ہوٹل کے ایک چھوٹے سے کیبن میں ٹھنڈے مشروب سے لب تر کرتے ہوئے وہ لڑکی رُندھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اب ہم نہیں ملیں گے۔''

''کیوں؟''لڑکے کا حلق خشک ہوگیا۔

''اب یہ میرے لیے مناسب نہیں رہا۔''

''مگر تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔''

''ہاں!لیکن اب میری شادی طے ہوگئی ہے۔''

''اسی آفیسر سے؟''

''ہاں!''

''اور وہ پیار جو تمہیں مجھ سے ہے۔''لڑکے کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

لڑکی کہتی رہی۔

''میں نے کچھ حسین خواب دیکھے ہیں ......ایک حسین زندگی کے خواب......ایک خوبصورت بنگلہ......چمچماتی ہوئی کار......قیمتی زیورات......کیا تمہارا پیار یہ ساری چیزیں خرید سکتا ہے؟''

لڑکے کو یکایک چپ سی لگ گئی۔کافی دیر بعد اس نے لب کھولے۔

''میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔''

''ہاں......تم نے سچ ہی کہا تھا۔''

اور پھر دونوں جدا ہو گئے۔

پانی پر بکھری ہوئی کئی لہریں سمٹ کر ایک نقطے پر آ رکیں۔بوڑھی عورت کو یکا یک کچھ یاد آ گیا۔

''تم نے شادی کی؟''

''نہیں۔''بوڑھے نے مختصر سا جواب دیا۔لیکن اس کے لہجے سے آسودگی ٹپک رہی تھی

''پھر تم اتنے برس کیا کرتے رہے؟''

''پیسے کماتا رہا۔اب میرے پاس بہت بڑی جائداد ہے......خوبصورت بنگلہ......خوبصورت کار اور خوبصورت زیورات۔''

''زیورات؟یہ کس کے لیے؟؟''بوڑھی عورت زیورات کا ذکر سن کر جیسے خوش ہوگئی تھی۔''

بوڑھے نے جواب دیا۔

''یہ زیورات کسی کے حسین تصور کے لیے ہیں۔''

پھر اس نے عورت سے پوچھا۔

''اور تم نے اس عرصے میں کیا کیا؟ کتنے بچے ہیں ہیں تمہارے؟؟''

''بچے......!''بوڑھی عورت کا چہرہ کرب کے سمندر میں ڈوب گیا۔پھر اس نے ہلکے سے کہا۔

''ایک......صرف ایک۔''

''صرف ایک؟''

''ہاں......!صرف ایک......مگر اب وہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔''

''کہاں ہے؟''

''کچھ پنچھی ایسے ہوتے ہیں جو اُڑنا سیکھ لینے کے بعد واپس نہیں آتے۔''عورت

نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''تو ان برسوں میں تمہیں کیا ملا؟''

''ایک خوبصورت بنگلہ......خوبصورت کار......حسین زیورات......مگر......''

''مگر کیا؟

''ایک چیز نہیں مل سکی۔''

''پیار......تمہاری جیسی محبت۔''

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔

تھوڑی ہی دور پر ایک نوجوان لڑکا ایک کمسن لڑکی سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہا تھا۔لڑکی مسکرا رہی تھی۔بوڑھے نے کہا۔

''انہیں دیکھتی ہو؟ ہوسکتا ہے پچاس سال بعد یہ دونوں پھر یہاں آئیں......ہماری طرح......ہم دونوں کی طرح۔''

اور بوڑھی عورت کا پورا رومال آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

☆☆☆

بٹا ہوا آدمی

آدمی کبھی کبھی کسی چیز کو کہیں پر رکھ کر بھول جاتا ہے۔ یا شاید بھول جانے کا ڈھونگ رچاتا ہے، میں بھی اس خط کو نہیں بھولا تھا، مگر ہفتہ بھر سے بھولا بیٹھا تھا۔آج جب میں نے بستر کو الٹا تو وہ ہرے رنگ کا لفافہ کونے میں دبکا پڑا تھا۔میں چند لمحوں تک سوچتا رہا۔پھر میں نے اس لفافے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر ایسا لگا جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ایک انجانا سا خوف میرے رگ و پے میں سما گیا۔میں چند لمحوں تک خوفزدہ نگاہوں سے اس لفافے کو دیکھتا رہا۔مجھے محسوس ہو رہا تھا گویا اس لفافے کے اندر کالے کالے ناگ چھپے بیٹھے ہیں اور میرے لفافے کو کھولتے ہی وہ سارے ناگ میرے جسم سے لپٹ جائیں گے۔سارے گھر میں ایک بے نام سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔رچنا اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی تھی اور بچے اسکول میں ہوں گے۔آج میں دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لے کر گھر چلا آیا تھا۔سر میں شاید درد تھا۔مجھے معلوم تھا کہ گھر میں نہ تو رچنا ہوگی اور نہ ہی بچے اور میں اسپرین کی ٹکیاں لے کر آرام سے سو گیا۔صاف کرنے کے لیے میں نے جیسے ہی بستر کا کونہ الٹا وہ لفافہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

یہ خط آج سے ایک ہفتہ قبل آیا تھا۔اس دن میں نے رچنا کے ساتھ پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔چپراسی سے میں نے دو ٹکٹ منگوا رکھے تھے۔گھر پہنچا تو دیکھا رچنا ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی۔میں نے ہمیشہ کی طرح پرجوش آواز میں ہانک لگائی۔

'' پکچر نہیں جانا ہے کیا؟ رچنا ڈارلنگ ! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' مگر میرے الفاظ اس کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہ کر سکے۔وہ بجھی بجھی سی بیٹھی رہی۔میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''کیا ہوا ڈارلنگ! کیا طبیعت خراب ہے؟'' اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکان ابھر آئی اور اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''نہیں تو۔''

''تو پھر پکچر جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

''آج من نہیں ہے۔''

''ارے واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ٹکٹ میری جیب میں ہیں اور......'' وہ میری بات کاٹ کو بولی۔

''پتاجی کا خط آیا ہے۔''

''اچھا!'' میرے حلق میں جیسے کوئی گولہ سا اٹک گیا۔کیا لکھا ہوگا پتاجی نے؟ میں نے میز پر پڑے ہوئے لفافہ کو پہلی بار دیکھا اور اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ایک لمحے کو میرے اندر ہلچل سی مچی مگر میں نے فوراً اپنے اوپر قابو پالیا، اور پھر ہونٹوں پو وہی شوخ مسکان سی اُبھری۔

''چلو بھی ڈارلنگ......'' اور اس لفافے کو بستر اٹھا کر اس کے اندر دفن کر دیا۔

اس ایک ہفتے کے اندر مجھے کئی دفعہ اس خط کی یاد آئی مگر ہر بار میرا ہاتھ بستر کا کونہ الٹتے الٹتے رک گیا۔اگر رچنا نے مجھے وہ خط دوبارہ پڑھتے دیکھ لیا تو نہ جانے کتنے دن چپ چپ رہے گی اور اس کا چپ ہو جانا میرے لیے قید تنہائی کا درجہ رکھتا ہے۔وہ جب کبھی روٹھ کر چپ سادھ لیتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔بچے بھی میرا من نہیں بہلا پاتے۔مگر آج جبکہ رچنا گھر میں نہیں تھی اور بچے بھی اسکول گئے ہوئے تھے اس خط کو غور سے پڑھنے کا اچھا موقع تھا۔مجھے اس خط کا مضمون اچھی طرح یاد تھا، مگر پھر بھی میں اس خط کو غور سے پڑھنا چاہ رہا تھا۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ اٹھا لیا۔اور میری نگاہیں کانپتے

ہاتھوں کی بوڑھی تحریر پر پھسلنے لگیں۔

بیماری......

تنہائی.......

بیٹے بہو اور پوتوں سے ملنے کی تڑپ......

اور

تنگدستی......

میں نے کتنی بار پتاجی سے کہا کہ اب گاؤں کا گھر چھوڑ دیں۔اور میرے ساتھ چل کر شہر میں رہیں مگر ان پرانے لوگوں کو نہ جانے کیوں اپنے آبائی وطن سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ریٹائر ہونے کے بعد پتاجی اپنے پرکھوں کے بنائے ہوئے کچے پکے مکان میں جا بسے تھے۔بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ماں کا دیہانت بہت پہلے ہو چکا تھا۔ایک میں تھا جو اپنی بیوی بچوں میں مگن تھا۔جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی تو ہر چھٹی میں گھر دوڑ جاتا تھا۔شادی کے بعد گھر آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔پتاجی نے جو کچھ کمایا وہ بہنوں کی شادی اور میری تعلیم پر اُٹھا دیا اور اب تہی دست گاؤں میں پڑے تنہائی کا زہر پی رہے تھے اور اب انھوں نے لکھا ہے کہ وہ گاؤں کا مکان بیچ کر شہر میں میرے ساتھ رہنا چاہ رہے ہیں۔

کال بیل کی آواز نے میرے بوجھل دماغ پر ہتھوڑے کا کام کیا۔میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔رچنا لوٹ آئی تھی۔مجھے گھر میں پا کر وہ چونک پڑی۔

''کیا بات ہے ہریش اس وقت......''

''کچھ نہیں رچنا، سر بھاری بھاری لگ رہا تھا۔اس لیے آدھے دن کی چھٹی لے کر آ گیا۔''

”اچھا کیا،ٹھہرو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”رہنے دو، میں خود سے بنا کر پی چکا ہوں۔تم کپڑے بدل آؤ۔“

رچنا دوسرے روم میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ میرا ذہن پھر اس خط کی طرف منتقل ہو گیا۔اس دن پکچر دیکھنے کے دوران بھی رچنا خاموش رہی اور گھر آنے کے بعد خاموشی سے بستر پر لیٹ رہی۔سوئچ آف کرنے کے بعد جب میرے ہاتھ حسب معمول اس کی چھاتی پر رینگنے لگے تو اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ ہٹا دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ رہی۔اور میں اندھیرے میں آنکھیں کھولے۔اس نئے مسئلے پر غور کرتا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

میں جانتا ہوں رچنا کچھ نہیں کہے گی۔مگر اس کا نہ کہنا ہی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔وہ کھل کر کسی چیز کی مخالفت نہیں کرتی ہے۔نہ ہاں نہ نا بس چپ ہو جاتی ہے اور میں اتنے برسوں سے اس کے ساتھ رہتے رہتے اس کی چپ کے معنی سمجھنے لگا ہوں۔میرا ذہن ایک لمحے کو بغاوت کرتا ہے۔پتا جی کو جا کر لے آؤں، مگر اگلے ہی رچنا کے سلے ہوئے ہوئے ہونٹ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔جب میں کنوارا تھا تو پتا جی کو ایک معقول رقم بھیجا کرتا تھا۔مگر شادی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شروع شروع میں میں نے کچھ روپے پتا جی کو بھیجے اور اسی زمانے میں مجھے رچنا کے چپ سادھ لینے کی عادت کا علم ہوا۔پہلے تو میں نے کچھ نہیں سمجھا مگر کافی غور کرنے کے بعد اس چپ کا رشتہ منی آرڈر تک جا پہنچا جو میں پتا جی کو کیا کرتا تھا۔اور پھر میں پتا جی کو روپے بھیجنے بند کر دیئے۔انہیں پنشن تو ملتی ہی ہے تو پھر روپے بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا۔اواب جبکہ پتا جی نے شہر آنے کا ارداہ ظاہر کیا تھا تو میں اس خط کی طرف سے

بے پروائی برت کر رچنا کو چپ سادھنے سے بچا لیا تھا۔

لفافہ اب بستر پر کسی ڈرپوک آدمی کی طرح سہما پڑا تھا۔رچنا کپڑے بدل کر آئی تو اس کی نگاہ لفافے پر پڑے وہ چونک پڑی۔

”یہ کسی کی چٹھی ہے؟“

”ارے کچھ نہیں رچنا ویسے ہی ایک چٹھی ہے۔“ اور میں نے اس خط کے پرزے پرزے کر کے کھڑکی کے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

”خواہ مخواہ گھر میں ردی جمع ہو جاتی ہے۔“

میرے اندر سے کسی نے کھڑکی کے باہر جھانکا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں مسکرا کر رچنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

ضرورت

اس چھوٹے سے گھر میں کل تین افراد تھے۔ ایک بوڑھا بیمار شخص، ایک سن رسیدہ عورت اور ایک نوجوان لڑکا۔ بوڑھا شخص یا تو دن بھر اونگھتا رہتا، یا کھانستا رہتا۔ وہ عورت جو اس شخص کی بیوی نہیں تھی، صبح سے رات گئے تک حسب معمول گھر کے کاموں میں مشغول رہتی اور وہ لڑکا صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا تو رات کے پہلے حصے میں گھر واپس ہوتا۔

وہ عورت اس لڑکے کی ماں نہیں تھی لیکن وہ اسے ماں کہہ کر پکارا کرتا تھا کیوں کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اسے اس گھر میں پایا تھا اور اس بوڑھے شخص نے جو کہ اس کا باپ تھا، اس نے اسے یہ سکھایا تھا کہ وہ اسے ماں کہا کرے۔ اس گھر میں کبھی کوئی جوار بھاٹا نہیں اُٹھا......کبھی کوئی طوفان نہیں آیا......حتیٰ کہ اس گھر سے باتیں کرنے کی آوازیں بھی بہت کم آتی تھیں......سوائے بوڑھے کی کھانسی کے اور کوئی آواز پڑوسیوں کو سنائی نہیں دیتی تھی۔ ان تینوں کی زندگی ایک خاموش معاہدے کے تحت گذر رہی تھی۔ نوجوان کا کام یہ تھا وہ پیسے کما کر گھر لائے۔ عورت کا کام یہ تھا کہ وہ گھر میں خانہ داری کے معاملات کو سنبھالے اور بوڑھے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنی بزرگی کا سایہ ان کے سروں پر قائم رکھے۔ ان تینوں کو شاید ہی کبھی بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس گھر میں کوئی آتا تھا اور نہ ہی یہ لوگ کسی سے ملنے جاتے تھے۔ ایسی خاموش اور پرسکون زندگی تھی ان تینوں کی جیسے قبرستان میں تین زندہ قبریں ہوں۔ لیکن ایک دن اس ساکت وجامد ماحول میں اچانک ایک پتھر آ گرا اور ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس خاموش اور پرسکون زندگی کے سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ بوڑھے کی کھانسی کچھ اور شدت اختیار کرگئی۔ اس عورت نے گھر کے کاموں میں ہاتھ کے ساتھ

ساتھ زبان بھی چلانا شروع کر دیا۔ وہ کام کرتے وقت خود ہی بڑبڑانے لگتی......کبھی جھنجھلا کر کوئی برتن پٹک دیتی یا کبھی ہانڈی کو اتنی تیزی سے چلاتی کہ دال چھلک کر باہر گر پڑتی اور وہ لڑکا اب رات کے دوسرے پہر گھر واپس آتا......جب ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی کی چادر کچھ اور دبیز ہو جاتی کیوں کہ اس گھر کے سکون کو درہم برہم کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا اور جو ہلچل اس گھر میں مچی تھی وہ اسی کی طفیل تھی۔ اس ہلچل کا نام تھا ''شالنی'' اور جسے وہ لڑکا پیار سے شالو کہا کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پتہ نہیں کب سے جانتے تھے لیکن اس کا پتہ نہ تو اس کے بوڑھے باپ کو تھا اور نہ ہی اس عورت کو لیکن ایک دن اچانک وہ اسے اپنے گھر سے آیا۔ اس گھر میں جہاں آج تک بلا ضرورت کسی غیر شخص کے قدم نہیں پڑے تھے۔ بوڑھی عورت نے اس کا استقبال ایسے کیا جیسے لوگ بن بلائے مہمان کا کرتے ہیں اور بوڑھا شخص آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا تھا۔ نوجوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا ہو۔ وہ لڑکی ضرورت سے زیادہ عقل مند اور سمجھدار تھی۔ معاملہ کو بھانپتے ہوئے فوراً جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان اسے الوداع کہنے کو دوازے تک آیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے لیکن الفاظ اس کے حلق کی قید سے آزاد نہیں ہو سکے۔ شالو نے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور چلی گئی۔ وہ نوجوان مجرم کی طرح سر جھکائے گھر کے اندر چلا آیا۔

اس رات اس عورت کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ جس پہلو سے بھی سوچتی اسے یہ بات بے تکی لگتی۔ بھلا اس گھر میں کسی چوتھے شخص کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہر کام معمول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ گھر میں کبھی کوئی جھگڑا، کوئی فساد نہیں ہوا۔ نہ ہی ان لوگوں کی کوئی ضرورت کسی وجہ سے ادھوری رہ گئی ہو۔ زندگی ہر طرح سے مکمل اور آسودہ تھی۔ پھر اس چوتھے وجود کو وہ برداشت کرے بھی تو کیوں کر؟ اس رات اس بوڑھے شخص کو بھی دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ معاملہ کو سمجھنا چاہتا تھا لیکن اس کا ناکارہ اور بوڑھا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکا تھا۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا گویا کہیں پر

کوئی تبدیلی آئی ضرور ہے۔ یہ تبدیلی اچھی ہے یا بری وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

اس رات اس نوجوان کو بھی نیند نہیں آئی۔ وہ نوجوان تھا۔ اس کے خون میں حرارت تھی اور سینے میں دھڑکتا ہوا دل تھا۔ اسے شالو سے محبت تھی جو اس کے دفتر میں اسٹینو تھی۔ وہ یتیم اور بے سہارا تھی اور ان دونوں نے ایک دن شام کو دفتر کے گھٹے گھٹے ماحول سے باہر ایک پارک میں مونگ پھلی کھاتے وقت یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شادی کرلیں گے اور اسی مقصد کے تحت وہ شالو کو لے کر اپنے گھر آیا تھا تاکہ وہ اسے اس عورت سے ملوا سکے جو اس کی ماں کے برابر تھی لیکن اسے جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اس کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھی......اور شرمناک بھی۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شالو کا سامنا کر سکے۔

یہ صورت حال کئی دن تک رہی۔ اس نوجوان نے بہت کوشش کی کہ اس چھوٹے سے گھر میں اس چوتھے وجود کو بھی جگہ مل سکے لیکن وہ عورت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑبڑاہٹ دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنے شوہر کا منھ دیکھنے کے کچھ ہی دنوں بعد بیوگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور جس کی ساری زندگی ان دونوں کی خدمت کرتے گزر گئی تھی۔ وہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھی اور وہ نوجوان اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔

اسی اُدھیڑ بن میں کئی روز گزر گئے اور وہ شالو سے کتراتا رہا۔ آخر ایک دن شالو نے اس کا راستہ روک لیا اور بغیر کسی تمہید کے اس نے کہنا شروع کیا۔

''سنجو! جس ضرورت کے تحت تم مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو وہ ضرورت تو گھر کے باہر بھی تو پوری کی جاسکتی ہے۔ تمہارے گھر میں نئی کونپلیں نہیں پھوٹ سکتیں کیوں کہ تمہارا گھر، گھر نہیں یخ بستہ جذبات کا قبرستان ہے۔'' اور اسے ایسا محسوس ہوا گویا شالو نے اس کے سارے مسئلوں کا حل آن واحد میں اس کے سامنے پیش کر دیا ہو۔

☆☆☆

جیل

میں اپنی یادوں کے نہاں خانے میں جب جب جھانکتا ہوں مجھے ہلکا ہلکا سا دھواں دکھائی دیتا ہے اور اس دھوئیں کے پس منظر میں ایک عظیم الشان حویلی نظر آتی ہے۔ دھندلی دھندلی سی اس حویلی کے کئی حصے تھے۔ باہر دیوان خانہ تھا جس میں ابا حضور ایزی چیئر پر بیٹھ کر حقے گڑگڑایا کرتے اور مہمانوں سے ملاقاتیں کرتے۔ اس میں بارہ دروازے تھے۔ اندر ایک طویل وعریض آنگن تھا۔ بڑے بڑے دالان تھے۔ کشادہ کمرے تھے۔ کھلی ہوئی چھت تھی۔ ایک حصہ گرمیوں میں ٹھنڈا رہتا اور دوسرا حصہ سردیوں میں بھی گرم رہتا۔ نہ پنکھے تھے نہ ایر کنڈیشن نہ ہیٹر......لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس حویلی میں کبھی اس قسم کی شکایت ہوتی ہو۔

حویلی کے باہر بگھی کھڑی تھی۔ بگھی پر میرا سامان رکھا جا چکا تھا۔ امی کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔ ابا کی آنکھوں میں ریگستان تھا۔ دل میں کوئی ہلچل ہو رہی ہو تو مجھے پتہ نہیں۔ میں شہر پڑھنے کے لیے جا رہا تھا۔ بے فکری اور آزادی جیسے الفاظ میرا ساتھ چھوڑنے والے تھے۔ کیوں کہ میں میٹرک پاس کر چکا تھا۔ اب کالج میں داخلہ لینے شہر جا رہا تھا۔ لیکن مجھے کوئی افسوس نہ تھا۔ کیوں میرے خوابوں میں اکثر شہر جگمگاتے، اونچی اونچی سر بہ فلک عمارتیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، آدمیوں کا ہجوم، موٹر گاڑیوں کا شور، روشنیوں کا سیلاب...... یہ سب مجھے اپنی طرف بلاتے تھے۔ لہٰذا میں بہت خوش تھا۔ ایک دفعہ میں ابا حضور کے ساتھ شہر گیا تھا اور وہاں خان چاچا کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ خان چاچا ابا کے قریبی دوست تھے۔ اور شہر کی ایک جیل میں جیلر تھے ایک دن انھوں نے ابا سے کہا۔

''چلو یار آج تمہیں جیل کی سیر کراتا ہوں۔'' میں نے سنا تو میں بھی مچل اٹھا۔ ابا نے سختی سے منع کر دیا لیکن خان چاچا نے کہا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بچے کے علم میں اضافہ ہوگا۔''

اور اس طرح میں بھی جیل دیکھنے چل پڑا۔ جیل کا ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ دروازے پر ایک مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ احاطہ کے اندر ایک سپاہی بندوق لیے سلاخوں کے اندر کھڑا تھا۔ اس نے خان چاچا کو سیلوٹ کیا اور ان کے اشارے پر جیل کا دروازہ کھول دیا۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ ایک لمبی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ دروازے پر مضبوط لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ کسی کسی قیدی کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ میرے ننھے سے دماغ میں اس وقت ایک ہی بات تھی۔ یہ قیدی بے چارے دھوپ ہوا اور روشنی سے محروم ہیں۔ اس چھوٹی سی کوٹھری میں بھلا زندہ کیسے ہیں اور مجھے اپنے گاؤں کی حویلی یاد آ گئی تھی۔ بڑے بڑے کشادہ اور روشن کمرے۔ ہم لوگ واپس چلے آئے۔ لیکن وہ چھوٹی چھوٹی بند کوٹھریاں میرے ذہن سے چپک کر رہ گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اے خدا اس عذاب سے دشمن کو بھی بچا۔

میں شہر چلا آیا۔ میرے شب و روز شہر کے شور میں گم ہونے لگے۔ ہوسٹل کی زندگی مجھے بڑی راس آئی۔ میرا کمرہ اوپری منزل پر تھا جس میں ایک بڑی سی کھڑکی آویزاں تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بہتی تو میرا ذہن گنگنا اٹھتا۔ وقت تیز رفتاری سے گذرتا گیا اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میں نے بی اے پاس کیا اور کب مجھے ایم۔ اے کی ڈگری مل گئی۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح سارا وقت گزر گیا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب تعلیم کی گاڑی رک گئی۔ میں گاؤں واپس آ گیا۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی حویلی میں اماں تنہا تھیں اور چند پرانے نوکر

تھے۔ چند ہی دنوں میں میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ شہر کی سڑکیں جیسے مجھے آواز دے رہی تھیں۔ میں نے کالج لکچرر کے لیے درخواست دی۔ انٹرویو ہوا اور چوں کہ میرا کیریر بہت شاندار تھا اس لیے پہلے ہی انٹرویو میں چن لیا گیا۔ پروانہ تقرری ملا تو جیسے میں خلاؤں میں پرواز کرنے لگا مگر ایک نئی اور انجان جگہ کا نام دیکھ کر دل بجھ گیا۔ اب تو تعلیم شہروں سے نکل کر چھوٹے چھوٹے شہروں قصبوں یہاں تک کہ گاؤں تک پہنچ گئی ہے۔ ہر جگہ کالج کھل گئے ہیں اور میری تقرری ایک چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے کالج میں ہوئی تھی۔ اس شہر میں آنے کے بعد مجھے یہ ادراک ہوا کہ شہر وہی بڑا ہوتا ہے جہاں کے لوگ اعلیٰ دماغ کے ہوتے ہیں اور جس شہر کے لوگوں کے دماغ چھوٹے ہوتے ہیں وہ شہر بھی چھوٹا رہ جاتا ہے......کسی ٹھٹھرے سہمے احساس کمتری سے چُور بچے کی طرح جو کلاس میں پچھلی بینچ پر بیٹھتا ہے۔ پہلے پہل جی میں آیا کہ ریزائن کر دوں لیکن عقل نے راہ دکھائی۔ میں نے قسمت پر صبر کرنا سیکھ لیا۔ اس شہر میں نہ اچھے ہوٹل تھے اور نہ ہی MESS کا رواج تھا۔ لہٰذا دل نے مشورہ دیا کہ گھر بسا لینا چاہئے اور گھر بسانے سے پہلے گھر کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا میں نے گھر کی تلاش شروع کر دی۔

''یہ دیکھیے، دو کمرے اور ایک دالان کرایہ کے لیے خالی ہے۔''

''لیٹرن اور باتھ روم؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ کامن ہے جس حصے میں مالک مکان رہتے ہیں آپ کو اسی طرف جانا ہوگا۔''

مکان دکھانے والے نے کہا۔ میں دل ہی دل میں لاحول پڑھ کر واپس آ گیا۔

دن گزرتے گئے، ہفتے تبدیل ہوتے گئے، موسم بدلتے رہے لیکن مجھے اپنی پسند کا مکان نہ ملا۔ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں، ٹوٹی کھڑکیاں، سیلن لگی دیواریں دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا۔ کافی تگ و دو کے بعد آخر ایک دن منزل میری نظر میں آ ہی گئی۔ مکان باہر سے بڑا دکھائی دے

رہا تھا۔اندر جا کر معلوم ہوا کہ مکان کے تین حصے تھے۔آنگن میں دیواریں تھیں لیکن لیٹرین اور باتھ روم ہر حصے کا الگ الگ تھا۔کھڑکیوں پر مضبوط جال لگی ہوئی تھی اور دروازے پر ایک مضبوط لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔دو چھوٹے چھوٹے کمرے......ایک مختصر سا دالان ایک چھوٹا سا کچن اور لیٹرین باتھ روم۔مالک مکان کہہ رہا تھا۔

’’رات کے وقت اس لوہے کے گیٹ میں تالا لگا دیجئے گا اور دروازہ بھی اندر سے بند رکھئے گا یہ علاقہ چوروں کو بہت پسند اور پھر یہاں فساد بھی ہوتے رہتے ہیں۔‘‘

لوہے کے دروازے میں تالا لگانے کے بعد میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید خدا نے میری دعا قبول نہیں کی جو میں نے جیل کی سیر کرتے وقت کی تھی۔

☆☆☆

قیامت

رات کے گونجتے ہوئے سناٹے میں ہوڑا دلی ڈیلکس اکسپریس تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔اس نے اپنا ہولڈال کھولا اور برتھ پر اپنا بستر لگا کر لیٹ رہا۔باون برس کی لمبی زندگی میں وہ پہلی بار دلی جا رہا تھا۔دلی جو بھارت کی راج دھانی ہے......دلی جو بھارت کا دل ہے......اور وہ طرح طرح کے سپنوں کے تانے بانے بُنتے بُنتے نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

پتہ نہیں وہ کون سا شور تھا جس سے اس کی نیند اچاٹ ہوگئی۔پہلے تو اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس شور کی وجہ جاننے کی کی کوشش کی،مگر دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن پوری طرح جاگ گیا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔سارا کمپارٹمنٹ ہچکولے لے رہا تھا اور مسافروں کا سامان سارے میں اڑتا پھر رہا تھا۔لوگوں کی چیخ وپکار کے بیچ اچانک اس کے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔گھبرا کر اس نے سوچا ......کہیں قیامت تو نہیں آگئی؟اسی لمحے اس کے سر پر کوئی سامان گرا اور اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اڑنے لگیں اور پھر وہ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو تیز سرچ لائٹ کی روشنی میں اس نے خود کو بے شمار گھائلوں اور بکھرے ہوئے سامان کے درمیان پایا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی،مگر اس کوشش کے ساتھ ہی کمر میں درد کی ایک تیز لہر پیدا ہوئی اور اسے پھر سے لیٹ جانا پڑا۔اور پھر اس نے اسی حالت میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی جان بچ گئی۔وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ اس حادثے میں مر گیا ہوتا تو اس کی بیوی نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی؟اس کی دونوں جوان بیٹیوں کی شادی کس طرح ہو پاتی؟اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوتا؟اگر خدانخواستہ

ایسا ہو جاتا تو ضرور ہی اس کے خاندان والوں کے لیے قیامت آ جاتی۔

اس کی واپسی پر اچھا خاصہ جشن منایا گیا۔ میلاد کی ایک محفل منعقد کی گئی۔ دوستوں کی دعوت ہوئی۔ سبھوں نے اسے اس طرح بچ جانے پر مبارکباد دی۔ اس کے بچے تو اسے دیکھ کر اس سے لپٹ گئے تھے اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ اس وقت وہ خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا۔

چوٹ معمولی تھی۔ دو تین آرام کرنے کے بعد اس نے باقی چھٹیاں کینسل کروادیں اور آفس جانا شروع کر دیا۔

ایک دن جب وہ شام کے وقت دل ہی دل میں پرانے وقتوں کا کوئی گیت گنگناتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو بیوی کی چیخ پکار سن کر اسے دروازے پر ہی رک جانا پڑا۔ اس کی بڑی لڑکی ماں سے کہہ رہی تھی۔

''مگر اس میں ابا کا کیا قصور؟ اس عمر میں بے چارے اتنی محنت کرتے ہیں۔ اب ان کی چھوٹی سی آمدنی میں گھر کا خرچ نہیں چلتا تو وہ کیا کریں۔''

''ارے! انہوں نے زندگی میں کیا ہی کیا ہے جواب کریں گے۔ اگر وہ اس ایکسیڈنٹ میں مارے جاتے تو کم سے کم تم دونوں کی ڈولیاں تو اٹھ جاتیں۔ سنا ہے کہ سرکار نے مرنے والوں کے وارثوں کو پچاس پچاس ہزار روپے دیے ہیں۔''

بیوی کی بات سنتے ہی اسے ایسا لگا کہ اس کے سر پر کسی کا بھاری سامان آ گرا ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے نیلی پیلی سی چنگاریاں اڑنے لگیں اور اسے سارا مکان ڈولتا نظر آنے لگا۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں قیامت تو نہیں آ گئی؟ اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

☆☆☆

کس کے لیے؟

آج تمہیں اس گھر سے گئے ہوئے پورا ایک ماہ ہو گیا۔ ایک ماہ......یعنی کہ تیس دن۔ یہ تیس دن میں کس عذاب میں گزارے ہیں یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ صبح ہوتی ہے، سورج نکلتا ہے، پرندے چہچہاتے ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت کا شور جاگ اٹھتا ہے۔ مگر میں بستر پر پڑا پڑا سوچتا رہتا ہوں۔ صرف تمہارے بارے میں۔ یہ چھوٹا سا گھر کتنا بھرا بھرا سا لگتا تھا جب تم یہاں تھیں۔ تم......تم جو میری زندگی ہو، میری حیات ہو۔ مگر آج تم مجھ سے سینکڑوں میل دور ہو اور میں اس گھر میں تنہا اور اداس ہوں۔ اب تو بیڈ ٹی کی عادت بھی چھوٹ گئی ہے۔ کوئی چائے بنانے والا نہیں رہا اور نہ ہی پیار سے پلانے والا۔ تمہاری وہ نرم نرم سی مسکراہٹ، میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میری آنکھوں سے نیند کا خمار اتارنے کا انداز اور چائے پی چکنے کے بعد جب میری آنکھوں سے نیند کا خمار اتر جاتا تو پھر میری چھیڑ چھاڑ، تمہارے قہقہے۔ اس کے بعد میں بستر سے اٹھ کر مہدی حسن کا کیسٹ لگا دیتا اور تم غزلوں کی دھن کے ساتھ ناشتہ بنانے میں مصروف ہو جاتیں۔ تمہیں مہدی حسن کی آواز بہت پسند ہے نا؟ پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ ناشتہ کرتے۔ سلائس پر مکھن لگا کر تم اپنے ہاتھوں سے میرے منھ میں رکھتیں اور سیب کی قاش اٹھا کر تمہارے منھ میں رکھتا۔ ادھر نو بجتے اور میں کالج جانے کی تیاریاں کرنے لگتا۔ تم میرے جوتوں پر پالش کرتیں، میرے کپڑے نکالتیں اور میں جب کپڑے بدل چکا ہوتا تو تم ہر زاویے سے میرا جائزہ لیتیں۔ کبھی کہتیں۔

''اس سفید شرٹ پر یہ پینٹ آپ کو سوٹ نہیں کر رہی ہے، دوسری پہن لیجیے۔''

اور میں فوراً کپڑے بدل لیتا۔ پھر وہ میرا الوداعی بوسہ اور تمہاری تاکید...... کالج سے جلد واپس آنے کی تاکید۔ کالج میں بھی بس تمہارے ہی خیالوں میں غرق رہتا۔ کبھی کلاس لیتے وقت اچانک تمہارا خیال آ جاتا۔ جب میں لڑکوں کو ''نیم باز آنکھوں'' کا مفہوم سمجھا رہا ہوتا یا پھر اس وقت ''جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا'' کی تشریح کر رہا ہوتا اور کلاس ختم ہوتے ہی میں واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ جس وقت اسٹاف روم میں دوسرے لوگ ہنسی مذاق کر رہے ہوتے یا پھر کسی موضوع پر زور زور سے بحث کر رہے ہوتے اس وقت میں گھر واپس ہو رہا ہوتا۔ ''ہوم، سویٹ ہوم'' اور اس سویٹ ہوم میں تم سراپا انتظار بنی میری راہ دیکھتی رہتیں۔ ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ پھر ہم ہوتے اور ہماری شوخیاں، اور تمہیں یاد ہے ہم لوگوں کی سیر و تفریح، کبھی پکچر، کبھی مارکٹ، کبھی گارڈن اور کبھی گنگا کنارے کی سیر۔ اب تو جیسے خواب و خیال کی باتیں ہو کر رہ گئیں ہیں۔ اب تو کالج سے گھر آنے کی جلدی بھی نہیں رہتی۔ کیا کروں گا گھر جا کر، کون انتظار کر رہا ہے میرا؟ اور میں وہیں اسٹاف روم میں بیٹھا لوگوں کی لایعنی بحثیں سنتا رہتا ہوں اور جب گھر لوٹتا ہوں تو گھر کا سناٹا میری روح کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور تمہیں یاد ہیں وہ راتیں، وہ خوبصورت سرگوشیوں بھری راتیں، وہ ہوا میں شراب کی سی تاثیر کا ہونا، وہ سانسوں کا زیر و بم، ایک دوسرے میں کھو جانے کی سعی اور اب میں سوچتا ہوں کہ آخر تمہیں مجھ سے دور جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جانتی ہو، تمہارے چلے جانے سے اس گھر کا کیا حال ہو گیا ہے؟ یہ دیکھو یہ گلاب کا وہ پودا ہے جسے میں نے خاص تمہارے لیے لگایا تھا تاکہ جب اس میں پھول کھلیں تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے جوڑے میں لگاؤں۔ اس پودے میں اب بھی گلاب کھلتے ہیں مگر ان کی پتیاں زمین پر بکھر جاتی ہیں، جیسے میری زندگی بکھر کر رہ گئی ہے۔ یہ ڈرائنگ روم...... اس کی کھڑکیوں پر لگانے کے لیے تم نے جو پردے اتنی محنت سے

قطرہ قطرہ احساس

بنائے تھے۔ وہ ڈائننگ ٹیبل جس پر بیٹھ کر ہم ساتھ ساتھ کھانا کھاتے تھے، گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے۔ آج کچھ لڑکے گھر پر آ گئے۔ وہ غالب کو پڑھنے آئے تھے۔ میں نے انھیں اسی گرد آلود کمرے میں بٹھا دیا۔ ایک لڑکے نے پوچھا،

''سر! کوئی پرانا کپڑا ہے آپ کے پاس؟''

''کیوں کیا بات ہے؟'' میں پوچھ بیٹھا۔

''سر! ٹیبل پر بہت گرد ہے، یہ دیکھیے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک انگلی سے ذرا سی گرد ہٹائی اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔ جب تم یہاں تھیں تو یہ گھر کیسا شیشے جیسا چمکتا تھا۔ میں نے اسے جوتے پر پالش کرنے والا برش دیا اور پھر ''کاوِ کاوِ سخت جانی'' اور ''تنہائی'' کا مفہوم سمجھانے لگا۔

اور یہ جو ہمارا بیڈ روم ہے، ادھر دیکھو، مسہری کے ڈنڈے پر گندے کپڑوں کا ڈھیر ہے، بستر میلا کچیلا ہے، لحاف ایک طرف پھینکا ہوا ہے اور خالی بستر میرا منھ چڑا رہا ہے۔

میری جان! آخر یہ کیسی سزا ہے؟ کیا ہوا گر میری آمدنی تسلی بخش نہیں ہے۔ کہنے کو تو مجھے ڈھیر سارے پیسے ملتے ہیں مگر وہ پیسے ہاتھوں سے یوں پھسل جاتے ہیں جیسے بام مچھلی۔ سال بھر سے سوچ رہا ہوں کہ تمہاری چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو بھی پورا کر دوں مگر چادر جتنی بڑھتی ہے پاؤں بھی اسی حساب سے بڑھ جاتے ہیں۔ تمہاری خواہش ہے کہ ہمیں کچھ پیسے پس انداز کرتے رہنا چاہیے تاکہ مستقبل میں اپنا گھر ہو۔ چھوٹا ہی سا سہی مگر میرے لیے تو یہ دیوانے کا خواب ہے۔ آخر تنگ آ کر تم نے ایک فیصلہ کیا اور میں نے اس فیصلے کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ تم نے نوکری کر لی اور دوسرے شہر چلی گئیں تاکہ ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیر مل سکے۔ مگر میں سوچتا ہوں، یہ سب کس کے لیے کر رہی ہو تم؟ جب تم ہی میرے پاس نہیں ہو۔

☆☆☆

پھانس

کوئی زنجیر اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

گیٹ کی جانب اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ اس نے گہری سانس لی۔ سرد ہوا کی ایک ہلکی سی لہر اسے اپنے وجود میں سرسراتی محسوس ہوئی۔ شاید کہیں آس پاس بارش ہوئی تھی۔ مسلم محلے کی نیم کشادہ اور گندی سڑک روشن تھی۔ دونوں اطراف مختلف قسم کی دکانیں اور ہوٹل تھے۔ سڑک پر کافی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد سے مغرب کی نماز پڑھ کر نکلنے والے سروں پر گول یا دو پلی ٹوپیاں ڈالے آس پاس کے چائے خانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ چند ایک اپنے ٹھکانوں کی جانب رواں تھے۔ نومبر ختم ہو رہا تھا۔ گلابی سردیوں کی شام بڑی روشن اور چہل پہل بھری تھی۔

’’دادا جان آپ کو یاد کر رہے تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کئی دنوں تک ہاسپٹل میں رہے۔ اب ٹھیک ہیں پرسوں ہی گھر لوٹے ہیں۔‘‘

سیف کی باتیں سن کر ایک لمحہ کو وہ وسیع و عریض مکان یاد آ گیا۔ اب تو بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پانچ سال گذر گئے۔ اب تو یہ شہر بھی اس سے چھوٹ چلا ہے۔ بس ایک ضروری کام سے آ گیا تھا۔ سڑک پر سیف سے ملاقات ہوگئی۔

’’اچھا آؤں گا اگر موقع ملا تو...... ابھی Secretariat جا رہا ہوں۔‘‘

وہ دن بھر فیصلے کرتا رہا تھا اور ان پر نظر ثانی کرتا رہا تھا اور اب جب کہ شام گہری ہو چلی تھی تو وہ اس گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ مگر کوئی زنجیر اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

ہر بار...... ہاں ہر بار کوئی زنجیر اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا کرتی۔ ایسا لگتا

جیسے اس کی ساری زندگی ان زنجیروں کو کاٹنے میں گذر جائے گی۔ الگ الگ قسم کی زنجیریں ...... کوئی بھاری، کوئی بہت بھاری اور کوئی بہت زیادہ بھاری۔ حالانکہ وہ ان میں سے کئی زنجیروں کو کاٹ چکا تھا مگر پھر بھی اس جانے پہچانے گیٹ کے سامنے اس کے قدم رکے کھڑے تھے۔ وہ جب بھی قدم بڑھانا چاہتا زنجیر کی جھنکار اس کے کانوں میں گونج اٹھتی۔ یہ کون سی زنجیر تھی؟ شرم، جھجھک یا پھر غربت اور نکبت کی ...... غربت اور نکبت کی زنجیر تو اس کی پیدائش کے وقت سے ہی اس کے پیروں میں پڑ گئی تھی اپنے آپ ...... اسے اپنا وجود ٹھٹھرا سکڑا سمٹا محسوس ہوتا، جیسے سوکھی دھرتی پر جنم لینے والا پودا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تو پورے گھر کو اس زنجیر میں جکڑا پایا۔ ان گنت بھائی بہنوں کے درمیان چھینا جھپٹی کے مناظر گویا اس کی آنکھوں میں ٹھہر سے گئے تھے۔ اس کی سیدھی سادی ماں جب کسی ضروری سامان کی خریداری کے لیے پیسے مانگنے اسے اس کے باپ کے پاس بھیجتی تو اس کا باپ اپنی خالی جیب الٹ کر خوب گرجتا۔ ساری زندگی ایمانداری کی روکھی سوکھی کھانے والا اس کا باپ ریٹائرمنٹ کے بعد کافی چڑچڑا ہو گیا تھا اور جب اس کا باپ اس پر گرجتا تو وہ سہم کر اپنی ماں کے آنچل میں پناہ لینے کے لیے اندر بھاگ جاتا۔ اس کی ماں کا چہرہ نچوڑے گئے کپڑے کی طرح سکڑ جاتا۔ بہنیں ادھر ادھر دبک جاتیں اور دونوں بڑے بھائی دھیرے سے باہر کھسک جاتے۔ کبھی کبھی جب وہ ٹفن کے وقت اسکول سے گھر آتا تو اسے پتہ چلتا کہ اس کا کھانا بچا ہی نہیں۔ وہ اپنی ماں کے سامنے خوب غصہ کرتا۔ اس کی ماں کہیں سے ایک آدھ چونی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی اور چونی لے کر اپنے باپ کی طرح بکتا جھکتا باہر نکل جاتا۔ بعد میں اس کی ماں اس کے حصے کا کھانا نکال کر نعمت خانے میں تالا لگا کر رکھنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے دوپہر میں کھانا کھانے کی عادت ہی ترک کر دی تھی۔ ناشتہ کر کے اسکول جاتا، ٹفن کے وقت اسکول

ہی میں کھیلتا رہتا اور پھر شام کو گھر آتا۔ زندگی میں کھانا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔

اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ چچا چچی، خالہ خالو، ماموں ممانی، پھوپھا پھوپھی، سبھوں کے گھر بھرے پرے تھے۔ وہ جب اپنے چاروں طرف نظریں دوڑاتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کا باپ سب سے زیادہ کثیر الاولاد تھا۔ اس کے گھر میں اس کے رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ چلتا رہتا اور قرض کی روشنی سے دسترخوان پر اجالا بکھرتا رہتا۔ آخر سفید پوشی تو نبھانی ہی تھی۔ ان دنوں اس کی پھوپھی آئی ہوئی تھیں۔ اس کی پھوپھی بولتی کم اور مسکراتی زیادہ تھیں۔ ایک دن جب وہ کسی چیز کے لیے ضد کر رہا تھا تو اس کی پھوپھی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''چھی......اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔''

اور انہوں نے اسے پچکارتے ہوئے پوچھا تھا۔

''شادی کروگے سنبل سے؟''

''نہیں کرنی مجھے شادی وادی کسی سے۔''

اور آج پھوپھی کے مکان کے باہر کھڑا وہ اپنے پیروں میں پڑی زنجیر کی جھنکار سن رہا تھا۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا تو اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اب وہ اسی شہر میں جا آگے کی تعلیم حاصل کرے گا۔ اس کے باپ نے اس کا فیصلہ سننے کے بعد کہا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں آگے پڑھنے کی۔ بس بہت ہو چکا۔ اب میں تمہیں اور آگے نہیں پڑھا سکتا۔ بڑے دونوں تو کسی لائق ہیں نہیں۔ کوئی نوکری تلاش کرو۔''

مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔

''محض بی۔اے پاس کو آج کل نوکری ملتی کہاں ہے۔ میرے پاس کوئی ٹیکنکل کوالی

فیکیشن بھی نہیں ہے۔ میں ایم۔اے کروں گا اور ساتھ ہی ساتھ کمپٹیشن کی تیاری بھی کروں گا۔ اس کے چھوٹے سے شہر میں یہ دونوں کام نہیں ہو سکتے۔''

''مگر اس کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے، میرے پاس تو نہیں ہیں۔'' باپ کی بات کا جواب دینے بجائے اس نے سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔

''رہو گے کہاں؟'' اس کی ماں نے دھیرے سے پوچھا تھا۔

''پھوپھی کے یہاں اور کہاں۔''

گویا اس نے پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا تھا اور پھر پتہ نہیں کہاں سے اس کے باپ نے دو سو روپے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا تھا۔

''میری تو تمنا تھی کہ تمہیں علی گڑھ بھیجتا مگر......'' اسے اپنے گلے میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ باپ سے نظریں ملانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

نہیں ......پہلی بار جب وہ اس وسیع وعریض مکان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا تو اس وقت اس کے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں تھی اور اگر کوئی زنجیر رہی بھی ہوگی تو اس کے مضبوط ارادوں کے آگے پگھل گئی تھی۔ بے شمار کمروں والے اس دو منزلہ مکان میں محض چار نفوس رہ رہے تھے۔ اس کی پھوپھی، سیف، سنبل اور پھوپھی کے سسر۔ پھوپھا انجینئر تھے اور کسی دوسرے شہر میں پوسٹیڈ تھے۔ اسے یاد نہیں کہ اس کے پھوپھا نے کبھی اس سے کوئی بات کی ہو۔ وہ اس کے گھر کبھی کبھار ہی آیا کرتے تھے اور جب آتے تو اس کے گھر کی اینٹ اینٹ کو حقارت سے دیکھتے۔ ان کے کان پر بڑے لمبے لمبے بال تھے جو بڑے گھناؤنے اور بدنما دکھائی دیتے۔ اسے اپنے پھوپھا ایک آنکھ پسند نہیں تھے۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ بازار اس دن بھی اسی طرح جگمگا رہا تھا۔ یہ حویلی نما مکان

کبھی کافی دور سے نظر آ جایا کرتا تھا مگر اب چاروں طرف سے دوسرے مکانوں سے گھر جانے کے بعد ایسا دکھائی دیتا جیسے بھیڑ بھرے ڈبے میں کوئی بھاری تن و توش کا آدمی چاروں طرف سے گھرا بیٹھا ہو۔اس نے بے دھڑک لوہے کا گیٹ کھولا اور اندر گھستا چلا گیا۔سیف جواب میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''ارے جمیل بھائی آپ یہاں کیسے؟'' پھر اس کی نظر اس کے سوٹ کیس پر پڑی تھی۔

''کہاں آئے ہیں؟''

''ایم۔اے میں داخلہ لینے۔'' اسے لگا جیسے اس کی بات سن کر سیف خوشی ہوا ہو۔

پھر وہ پھوپھی سے ملا اور سنبل سے بھی۔تبھی دادا جان کمرے سے باہر نکلے۔

''اچھا جمیل میاں ہیں، کیسے آنا ہوا؟'' جمیل کو ان کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔

''جمیل بھائی ایم۔اے میں ایڈمیشن لینے کے لیے آئے ہیں۔'' سیف نے چہک کر کہا تھا۔

''بیکار ہے۔ایم۔اے کر کے کون سا بڑا تیر مار لیں گے۔آج کل نوکری حاصل کرنے کے لیے یا تو پیسہ چاہئے یا پیروی۔''

دادا جان نے جیسے کانٹا سا چبھو دیا ہو۔اس نے دادا جان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔وہ بڑے سرکاری افسر رہ چکے تھے۔گھر میں سبھی لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور ان کا فیصلہ آخری ہوا کرتا تھا۔پھر سیف اسے لے کر اوپری منزل پر چلا گیا تھا۔اوپر سارے کمرے بند پڑے تھے۔سیف نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔کمرے میں اندھیرا تھا۔سیف نے بازار کی جانب کھلنے والی کھڑکی کھولی تو تازہ ہوا کے ساتھ نیچے بازار کی روشنیاں بھی اندر گھس آئیں۔اس نے ایک خوشگوار فرحت محسوس کی۔پھر سیف نے بلب روشن کیا اور نیچے سے ایک ٹیبل فین اٹھا لایا۔رات کا کھانا سبھوں نے ایک ساتھ کھایا۔کھانے کی میز پر پُراسرار سی خاموشی چھائی

تھی۔سیف نے Casserol اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور لیجئے۔''

''نہیں۔بہت ہو چکا۔''

''ایک اور۔'' سیف نے اصرار کیا۔تبھی دادا جان بول پڑے۔

''اب یہ انکار کر رہے ہیں تو کیوں زبردستی کر رہے ہو۔''

ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔اس نے کرسی کھسکائی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ دھو کر اوپر چلا گیا۔تھوڑی دیر بعد سیف بھی سلیپنگ سوٹ پہن کر آ پہنچا۔پھر دونوں باتیں کرنے لگے۔اچانک سیف نے پوچھ بیٹھا۔

''دادا جان پوچھ رہے تھے کہاں رہنے کا ارادہ ہے؟''

''کہاں رہنے کا ارادہ ہے، کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہوسٹل میں رہئے گا یا لاج میں؟''

سیف کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔اس کی زبان گنگ ہو گئی۔پھر سیف نے آگے کہنا شروع کیا۔

''ہوسٹل میں تو جگہ ملنا مشکل ہے۔یہاں بہت سارے لاج ہیں۔میں آپ کو ایک کمرہ دلا دوں گا اور کھانا تو ہوٹل میں......''

''یہاں ٹیوشن وغیرہ......؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔بہت ٹیوشن ملیں گے۔سب انتظام کر دوں گا۔آپ بے فکر رہئے۔''

اور پھر دوسرے ہی روز ایک لاج میں منتقل ہو گیا تھا۔سیف نے اس کے لیے کئی ٹیوشنز کا بندوبست کر دیا تھا۔اس دوران اس نے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا۔زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی۔مگر ساری مصروفیات سے وقت نکال کر وہ کسی وقت پھوپھی کے گھر پہنچ جایا

کرتا۔ یہ اور بات تھی کہ جب تک وہ وہاں رہتا اسے اپنے آس پاس ایک سایہ سا منڈلاتا دکھائی دیتا۔ دادا جان اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے۔ اسے جھنجھلاہٹ ہوتی۔

اس دن بھی وہ حسب معمول پھوپھی کے گھر پہنچا۔ گھر پر سیف اور دادا جان تھے۔ پھوپھی اور سنبل کہیں گئی ہوئی تھیں۔ سیف اسے لے کر اوپر چھت پر چلا گیا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ پھر اس کی پھوپھی اور سنبل لوٹ آئی تھیں۔ دادا جان کو سویرے کھانا کھا کر سونے کی عادت تھی۔ وہ بے چینی کے ساتھ آنگن میں ٹہل رہے تھے۔ پھوپھی جان اور سنبل دونوں کچن میں جا گھسیں۔ وہ جانے کو مڑا۔ تبھی اس کی پھوپھی نے پکار کر کہا۔

”کھانا تو کھا کر جاؤ“ وہ وہیں کچن کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک دادا جان پاس آ کھڑے ہوئے۔

”آپ بھی کھانے کے انتظار میں کھڑے ہیں کیا؟“ ایک تیر تھا جو اس کے سینے میں اٹک کر رہ گیا۔ ان کے لہجے میں کوئی بات تھی، جیسے اسے اس کی اوقات بتا رہے ہوں۔ وہ تیزی سے مڑا اور پھوپھی کی پکار کی پروا کیے بغیر نکل پڑا۔ باہر روشنیاں جگمگا رہی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے کرچیاں گھس آئی تھیں۔ پھر وہ اس علاقے کے سب سے اچھے ہوٹل میں جا گھسا تھا۔ پیٹ بھر اور جی بھر کھانا کھا چکنے کے بعد اس نے ایک پیالی چائے پی، ایک سگریٹ سلگا کر شاہانہ انداز میں کش لیا اور پھر تیزی کے ساتھ اپنے اندر کی ساری کڑواہٹ کو دھوئیں میں لپیٹ کر باہر اگل دیا تھا۔

اس دن کے بعد پھر وہ اپنی پھوپھی کے یہاں نہیں گیا۔ سیف کئی بار اسے منانے آیا مگر وہ ہر بار ٹال گیا۔ ایک زنجیر تھی جو دادا جان نے اس کے پیروں میں پہنا دی تھی۔ ان کا لہجہ اور لہجے کی وہ کاٹ اس کے سینے میں کھب کر رہ گئی تھی۔ اور پھر سنبل کی شادی طے ہو گئی......

شادی کا کارڈ سیف پہنچا گیا تھا۔ وہ شادی کی تقریب میں بھی نہیں گیا۔ بعد میں جب کبھی

پھوپھی سے کہیں ملاقات ہوتی، اسے پھوپھی کی نگاہوں میں شکایت اور پچھتاوے کے ملے جلے نقوش نظر آتے۔ اسے اپنی پھوپھی سے ہمدردی تھی۔

اور اب پانچ سال کے بعد وہ پھر اسی گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔

”دادا جان آپ کو یاد کر رہے تھے۔“ سیف کا جملہ پھر اس کے کانوں میں گونجا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی جھجک کو توڑتا ہوا گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمیشہ مسکرانے والی پھوپھی اسے دیکھ کر رو پڑیں۔ پھوپھا جان بھی آئے ہوئے تھے۔

”جوائن کر لیا۔“ پھوپھا جان نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”جی! دادا جان کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں......آؤ۔“ دادا جان بستر پر لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ارے جمیل میاں ہیں۔“ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”لیٹے رہیے، لیٹے رہیے۔“ اس نے آہستگی کے ساتھ ان کے شانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”آج سیف سے معلوم ہوا تو......آپ کو دیکھنے چلا آیا۔“

”بہت اچھا کیا، بہت یاد آ رہے تھے تم۔“ دادا جان نے اتنے برسوں سے اس کے نہ آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔ شاید دونوں ہی اس تکلیف دہ پہلو سے پہلوتہی کرنا چاہ رہے تھے۔

”سیف کہاں ہے؟“

”ہاسپٹل گیا ہے۔ نائٹ ڈیوٹی ہے آج۔“

پھوپھی جان ناشتے کی ٹرے لیے ہوئے آئیں۔ پھوپھا جان پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر نے دادا جان کو زیادہ بولنے سے منع کیا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنی پھوپھی کے سوالوں کا جواب دیتا رہا تھا۔ اچانک پھوپھی پوچھ بیٹھیں۔

''شادی کب کر رہے ہو؟'' وہ بس مسکرا کر رہ گیا تھا۔ مگر دادا جان بول پڑے۔

''اب ان کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ ماشاء اللہ بڑے افسر ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے اس کے شاندار سوٹ کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سبھوں کو معلوم تھا کہ اس مقابلہ جاتی امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کر لی ہے اور اب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ پھر دادا جان رک رک کر اس سے اس کی نوکری میں سوالات کرتے رہے اور وہ ان کے سوالوں کے مناسب اور موزوں جوابات دیتا رہا۔ پھوپھی جان شاید کچن میں تھیں۔ جب اچھا خاصہ وقت گزر گیا تو اس نے دادا جان سے جانے کی اجازت مانگی۔ دادا جان نے اپنا کمزور اور لرزتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہنے لگے۔

''اتنے برسوں بعد آئے ہو۔ کھانا تو کھا کر جاؤ۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک زہرخند مسکراہٹ دوڑ گئی۔ برسوں سے چبھی ہوئی پھانس آخر آج نکل ہی گئی۔

پھر دادا جان اور پھوپھی جان کے بہت اصرار کے باوجود وہ وہاں نہیں رکا تھا۔

☆☆☆

چھوٹا آدمی

وہ ہر لحاظ سے چھوٹا آدمی تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اس کا چہرہ چھوٹا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا تھا اور کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ جس میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، ایک چھوٹا سا دالان تھا، ایک چھوٹا سا آنگن تھا، چھوٹا سا کچن اور چھوٹا ہی سا باتھ روم تھا۔ مگر اسکی فیملی بہت بڑی تھی۔ ایک بوڑھا بیمار باپ تھا جو ہر وقت باہر والے کمرے کے ایک کونے میں بستر پر لیٹا لیٹا کھانستا رہتا۔ اسکے پلنگ کے نیچے ایک اگال دان رکھا رہتا جس میں وہ وقفے وقفے سے تھوک اور بلغم نکالتا رہتا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر چھوتی چھوٹی سفید داڑھی بھری تھی جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا گویا اس کے گالوں پر ڈھیر سارے چیونٹی کے انڈے چپک گئے ہوں۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ہنسلی کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک ماں تھی جس کے سر پر سفید بالوں کا بے ترتیب جھنڈ پھیلا ہوا تھا۔ وہ بھی اپنے شوہر کی طرح نحیف و نزار تھی مگر وہ دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ اس کا زیادہ تر وقت کانپتے ہاتھوں سے شوہر کے پیروں کی ہڈیاں دبانے میں گذرتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے چھوٹے پوتے کو گودی میں کھلاتی، کبھی سبزی چھیلتی یا آنگن اور دالان میں دھیرے دھیرے جھاڑو لگاتی۔ اس شخص کی ایک بیوی تھی جس کے چہرے اور بدن کا گوشت غربت کا گدھ نوچ نوچ کر کھا چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک پھٹی پرانی ساڑی میں ملبوس نظر آتی۔ اس کا سر ہمیشہ پلو سے آدھا ڈھکا، آدھا چھپا رہتا کیوں کہ پلو کے پھٹے ہوئے حصے سے اس کے روکھے سوکھے ملگجے سے بال جھانکتے رہتے۔ وہ گونگی نہیں تھی لیکن ہمہ وقت خاموش رہتی۔ کبھی کسی نے

کچھ پوچھ لیا تو جواب دیتی ورنہ چپ رہتی۔ اس کے چہرے کا شہابی رنگ لکڑی اور کوئلے کے دھوئیں کا غازہ مل کر دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ دھوئیں کی کسیلی بو کے سارے جسم میں رچ بس گئی تھی۔ وہ جب اپنے شوہر کے ساتھ لیٹتی تو اس کے شوہر کو ایسا محسوس ہوتا گویا وہ کسی لکڑی کے چولھے کے بغل میں لیٹا ہے اور گاڑھا ملگجا، کڑوا دھواں اس کے حلق کے اندر اتر رہا ہے۔ اسکے چھ بچے تھے۔ سب سے بڑا بارہ سال کا تھا اور ایک سرکاری اسکول میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اس کا قد اس کے باپ کے قد کے برابر ہو چکا تھا لہٰذا اب وہ اپنے باپ کے اتارے ہوئے کپڑے پہنتا تھا۔ وہ گھر سے سیدھا اسکول جاتا اور اسکول سے سیدھا گھر آتا۔ اسکی محلے میں کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد تین لڑکیاں تھیں۔ ایک گیارہ برس کی، ایک دس برس کی اور ایک آٹھ برس کی۔ تینوں ایک مسلم گرلس اسکول میں پڑھنے جاتی تھیں اور اسکول کا یونیفارم پہنتی تھیں۔ ان کے بعد ایک لڑکا تھا پانچ برس کا تھا جو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگتا رہتا اور زیادہ تر آدھے بدن سے ننگا دکھائی دیتا۔ سب سے چھوٹا لڑکا ابھی دس ماہ کا تھا جو زیادہ تر وقت ماں کی گود سے چپکا رہتا اور اسکے سوکھے پستانوں میں رزق تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اسکی ماں بلاؤز کا بٹن کھول کر اپنی کسی ایک سوکھی چھاتی کا نپل اس کے منھ میں ڈال دیتی اور وہ ایسے چوستے چوستے سو جاتا لیکن پھر بھوک کی شدت سے جاگ اٹھتا اور بلبلا کر رونے لگتا۔

اسکی چار بہنیں تھیں۔ بڑی تین بہنوں کی شادی تو اس کے باپ نے جیسے تیسے کر دی تھی لیکن چوتھی بہن جیسے بھیگی ہوئی روئی ہو چکی تھی جسے کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ آخر اس نے بڑی بڑی مشکلوں سے لگ بھگ ڈیڑھ سال قبل اس کے ہاتھ پیلے کر دئے تھے جس کے لیے اسے اپنے Provident Fund خاصی بڑی رقم نکالنی پڑی تھی اور پھر اگلے ماہ سے جب Loan Recovery ہونے لگی تو اس کے ہاتھوں میں سکڑی سمٹی تنخواہ ملنے لگی اور ابھی

مزید چھ ماہ تک اسے اس آدھی ادھوری تنخواہ پر گذارا کرنا تھا۔

وہ شخص ایک آفس میں کلرک تھا اور ایک بندھی ٹکی روٹین پر زندگی گذارتا تھا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اسکی آنکھ کھل جاتی وہ اُٹھتا، وضو کرتا اور مسجد کی جانب روانہ ہو جاتا۔ وہ تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بیٹھتا اور اس کے سرہانے پڑے بوسیدہ اور پھٹے پھٹے سے نسخے کو غور سے دیکھتا جس پر اسپتال کے ڈاکٹر نے چند دوائیوں کے نام لکھ رکھے تھے۔ اب وہ حرف کافی حد تک مٹ چکے تھے اور ان دوائیوں کا نام صحیح صحیح پڑھ پانا مشکل تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا اور دالان میں بچھی چوکی پر جا کر بیٹھ جاتا۔ اسکی بیوی کچن میں دھوئیں میں گھری نظر آتی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کا بڑا بیٹا اور تینوں بیٹیاں اپنی اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر اس کے پاس آ جاتے اور وہ انہیں پڑھانے لگتا۔ پانچواں بچہ کچن میں ماں کا پہلو تھامے کھڑا رہتا اور اسکی نظریں توے پر پکتی روٹی پر جمی رہتیں۔ چھوٹا بچہ دادی کی گود میں پڑا روتا رہتا۔ بچوں کو پڑھانے کے بعد وہ ناشتہ کرتا اور ایک ساجھولا لیکر بازار کی جانب نکل جاتا۔ پہلے وہ پورے بازار کا ایک چکر لگاتا اور سبزیوں کے دام پوچھتا جاتا اور پھر جو سبزی سستی ہوتی اسے خریدتا اور گھر لوٹ جاتا۔ اس کے بعد وہ غسل کرتا اور تیار ہو کر آفس کے لئے نکل جاتا۔ Lunch Break کے وقت وہ گھر سے لائی ہوئی روٹی سبزی کھاتا اور پھر پاس کی مسجد میں جا کر ظہر کی نماز ادا کرتا۔ چھٹی کے بعد وہ سیدھا گھر آتا، عصر کی نماز پڑھتا، تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بیٹھتا اور پھر بچوں کو پڑھانے بیٹھ جاتا۔ عشا کی نماز کے بعد کھانا کھاتا اور سو رہتا۔

جب سے اسے نوکری ملی تھی وہ اسی شہر میں تھا۔ وہی آفس وہی میز، وہی فائلیں سب کچھ وہی تھا صرف صاحب بدلتے رہتے۔ اس کے پہلے صاحب بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ سارا اسٹاف ان سے خوش تھا۔ اسے بھی صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن صاحب کو

اس سے شکایت تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ اپنے کام میں کوتاہی برتتا تھا بلکہ وہ تو ہمیشہ وقت پر آفس آتا دل لگا کر اپنا کام کرتا اور آفس ٹائم اوور ہونے کے بعد ہی گھر جاتا۔ کوئی بھی فائل اسکی میز پر دو دن سے زیادہ نہیں رکھی تھی اور اسی سے اس کے صاحب کو اس سے شکایت تھی وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح نوکرے کرے اسرار ورموز سے واقفیت حاصل کرے، خوش رہے، خوشحال رہے، صاحب نے کئی دفعہ اسے اشارے کنائے میں سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ صاحب کی بات سمجھ کر بھی ناسمجھ بنا رہنا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن صاحب نے کھل کر کہہ دیا۔

’’میں جانتا ہوں کہ آپ بڑے محنتی اور ایماندار ہیں۔ میں آپ کے کام سے بہت خوش ہوں۔ آپ کی شخصیت سونے جیسی ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ سونے میں جب تک کھوٹ نہیں ملائی جاتی ہے اس سے زیور تیار نہیں ہوتا۔‘‘

اس نے صاحب کی بات بڑے صبر وسکون کے ساتھ سنی اور بغیر کوئی جواب دیئے سر جھکائے واپس چلا آیا۔ اس دن کے بعد صاحب نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند سال بعد صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا اور نئے صاحب نے آفس کا چارج سنبھالا۔ نئے صاحب نے آتے ہی اسے طلب کیا۔ وہ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو صاحب نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ چکا تو صاحب نے کہا۔

’’میں نے آپ کی بڑی تعریف سن رکھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ابھی ایمانداری کا ستارہ ظلمت کی بدلیوں کا سینہ چیر کر اپنے ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ آج سے ہم دونوں مل کر اس آفس سے بدعنوانی کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں گے۔‘‘

اس کا رواں رواں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس بھیڑ میں تنہا نہیں ہے۔ پھر صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا اور اسکی پیٹھ تھپتھپائی۔ اسے اپنا قد اونچا ہوتا ہوا محسوس ہوا اور وہ شان

سے اکڑتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ چند روز کے اندر ہی پورے آفس میں کھلبلی مچ گئی۔ کئی زیر تعمیر مکان بنتے بنتے رہ گئے۔ ایک لڑکی کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی اور پتہ نہیں کیا کیا افتاد پڑتی لیکن چھ مہینے کے اندر ہی صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت صاحب نے اس سے کہا۔

’’میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تک میں جھاڑو سنبھالتا ہوں، میرا ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے لیکن جاتے جاتے ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ہاتھوں میں جو شمع ہے اسے بجھنے مت دیجئے گا تاریکی خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو ایک شمع کی مدھم سی روشنی اس میں شگاف پیدا کر دیتی ہے۔ گڈ بائی۔‘‘

اسے لگا جیسے وہ پھر سے تنہا ہو گیا ہو۔ اس نے بھاری دل سے صاحب کو رخصت کیا اور نئے صاحب کے متعلق خدشات لیے اپنی میز پر جا بیٹھا۔

نئے صاحب جوان تھے، بدمزاج تھے، منھ پھٹ اور بدتمیز تھے۔ مگر ان کے آتے ہی سبھوں نے راحت کی سانس لی اور جیسے رکی ہوئی مشین پھر سے چل پڑی ہو۔ صاحب نے اپنی دوڑ شروع کی تھی۔ ان کے جسم میں گرم خون تھا۔ وہ خوب تیز دوڑے اور ان کے ساتھ ساتھ سبھی دوڑ پڑے۔ صرف وہ پیچھے رہ گیا۔ کسی پولیو زدہ بچے کی طرح۔ صاحب کو اس سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اسے حقارت سے مخاطب کرتے۔ اسے طرح طرح سے پریشان کرتے۔ اسکے مختصر وجود کو اپنی زبان کے ٹارچر سیل میں ڈال کر اسے طرح طرح کی اذیت سے ذائقہ آشنا کراتے لیکن وہ کسی پتھر کی طرح اپنی جگہ پر اڑا رہا۔ آخر ایک دن اسے صاحب نے طلب کیا اور کہا۔

’’میں آپ کی سروس فائل دیکھ رہا تھا۔ آپ جب سے اس سروس میں آئے ہیں اسی آفس میں جمے ہوئے ہیں۔ میں آپکے ٹرانسفر کا Recomendation اوپر بھیج رہا ہوں۔‘‘

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔سر جھکا کر واپس چلا آیا اور اپنی میز پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ ٹرانسفر ہو جانے کے بعد اسے کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔اسے اس طرح افسردہ بیٹھا دیکھ کر بڑا بابو ان کے پاس آئے۔ بڑا بابو صاحب اور اسٹاف کے درمیان رابطے کا کام کرتے تھے اور دونوں کے فائدے کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔کسی صاحب کا کام بڑا بابو کے بغیر نہیں چل سکتا تھا اس لیے صاحب بھی بڑا بابو کا بڑا خیال رکھتے تھے۔اس نے بڑا بابو سے ٹرانسفر والی بات بتادی۔ وہ اٹھے اور سیدھے صاحب کے چیمبر میں جا گھسے۔کافی دیر بعد اسے بھی چیمبر میں طلب کیا گیا اور تب بڑا بابو نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

’’سنئے مسٹر۔آپ کے پاس جو سیدھی سادی فائل آئے اسے خود نپٹا لیجئے لیکن جو ذرا ٹیڑھی فائل ہو اسے صاحب کے پاس بھیج دیا کیجئے آپ گنگا نہیں نہانا چاہتے ہیں مت نہایئے مگر دوسروں کو تو اشنان کرنے دیجئے۔‘‘

چنانچہ اس دن کے بعد سے یہی ہونے لگا اور اس کی بندھی ٹکی زندگی اپنی معمول پر چلنے لگی۔لیکن ادھر چند روز سے اسکی گاڑی پھر ہچکولے کھانے لگی تھی۔اسکے بوڑھے باپ کی کھانسی میں شدت پیدا ہو گئی تھی،بچوں کو نئی کتابیں اور کاپیاں درکار تھیں اور اسکی بیوی کی ساڑی کے سوراخوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔لیکن اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس کا سب سے چھوٹا بچہ بیمار پڑ گیا کیونکہ ایک دن جب کافی دیر تک چوسنے کے بعد بھی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا اور وہ بھوک کی شدت سے روتے روتے بے حال ہو گیا تو ماں نے اسے روٹی کھلا دی۔رات بھر دست آئے۔اسکی بیوی نے گھبرا کر اسے اٹھا دیا۔اس وقت وہ کہاں جاتا کیا کرتا،بس بیوی کو دلاسہ دیتا رہتا۔اور پھر اندھیر چھٹتے ہی وہ بچے کو لے کر پاس کے ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر کے پاس جا پہنچا۔کافی دیر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ڈاکٹر اٹھا۔اس نے بچے کا

معائنہ کیا اور پھر چھوٹی چھوٹی پڑیوں میں دوا پلیٹ کر دی۔اور اس سے پانچ روپے طلب کیے۔ اس نے ڈاکٹر کو روپے دیئے اور گھر آ کر بچے کو دوا دی۔تین چار خوراک کے بعد بچے کی حالت قدرے سنبھل گئی۔اس دن گھر میں ناشتہ نہیں بنا۔بچے یوں ہی اسکول چلے گئے۔پانچواں بچہ روٹی روٹی چلاتا رہا اور اسکی دادی اسے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔جب اسے نے دیکھا کہ بچے کی حالت اب سنبھل گئی ہے تو آفس جانے کے لیے اٹھا اور تب اسکی بیوی نے،اس کی بے زبان بیوی نے زندگی میں پہلی بار بلند آواز میں کہا۔

’’اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں جان دیدوں گی،آپ کہیں سے بھی پیسے لایئے اور اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھلایئے‘‘اور پھر وہ بچے کو کلیجے سے لپٹا کر رونے لگی۔

’’وہ چپ کھڑا رہا۔وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اپنے بچے کو کسی SpecialistChild سے دکھلائے مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے بچے کی بیماری کیا ہے۔اسے دوا سے زیادہ دودھ کی ضرورت تھی۔اور اسکی قسمت کا دودھ نہ اسکی ماں کی چھاتیوں میں اترا تھا نہ کسی گائے بھینس کے تھن میں اور نہ ہی کسی دودھ کے ڈبے پر اس کا نام لکھا تھا۔اس نے اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے دلاسہ دینا چاہا،پھر بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آفس کے لئے روانہ ہو گیا۔ اسے شاید پہلی بار آفس پہنچنے میں دیر ہوئی تھی۔اس نے دیکھا کہ ایک اجنبی،اسکی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔اس نے بڑے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔وہ اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

’’کہیئے کیا بات ہے؟‘‘

اجنبی کرسی پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور پھر ذرا سا کھنکھار کر کہنے لگا۔

’’ایک ضروری کام ہے آپ سے۔‘‘

"ہاں ہاں کہئیے کیا کام ہے؟"

وہ شخص ایک لمحے کو چپ رہا، پھر کوٹ کی اوپری جیب سے ایک درخواست نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

"یہ میری درخواست ہے۔"

اس نے غور سے درخواست پڑھی۔ پھر اپنی میز پر پڑی فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ آخر کار اسے مطلوبہ فائل مل گئی۔ اس نے فائل اپنے سامنے رکھ لی اور بولا۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ اب آپ جائیے۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ لیکن اس کام میں دو دن لگیں گے۔"

اس شخص کو ایسا لگا جیسے وہ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک دبیز گڈی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کے اصول پر چلتا ہوں۔ آپ اسے رکھیے اور میرا کام کر دیجیے۔

اس نے ایک نظر گڈی پر ڈالی۔ سو سو کے نوٹ تھے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر گڈی اٹھا لی۔ ایک لمحے کو اسکی انگلیوں نے نوٹوں کی گرمی کو محسوس کیا۔ پھر اس شخص کی درخواست اٹھائی، درخواست پر گڈی رکھ کر اسے موڑ کر پیکٹ بنایا اور فائل میں رکھ کر فائل بند کر دی اور پھر اس نے فائل اس شخص کو دیتے ہوئے کہا۔

"آپ سیدھے صاحب کے پاس چلے جائیے۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

☆☆☆

قطرہ قطرہ احساس

دوریاں

کئی برس سے نسرین آپا مجھ سے خفا ہیں اور ان کی یہ خفگی بجا بھی ہے۔ اور جس دن سے مجھے ان کی خفگی کا علم ہوا ہے میں خود کو چور سا محسوس کرتا آ رہا ہوں۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی نجی زندگی میں جھانکنے کا۔ آخر کو وہ میری اپنی بہن تو تھیں نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے کبھی انہیں اپنی سگی بہن سے کم نہیں سمجھا۔ ان کی شفقت آمیز مسکراہٹ کو میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ میں ان گہرے سمندر کی سی نیلی آنکھوں میں موج در موج محبت کی لہروں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟ ان کی پیاری باتیں عرصہ سے میری کانوں میں نہیں پڑی ہیں، لیکن آج بھی ان کی گونج میرے دل و ذہن میں موجود ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ کاش وہ میری اپنی بہن ہوتیں، بالکل اپنی...... لیکن کیا وہ اپنوں سے کچھ کم تھیں؟ مگر اپنائیت کی یہ ڈور خود میرے نادان ہاتھوں کے ایک ہلکے سے جھٹکے سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی اور میں اس لمحہ کو یاد کر کے رو پڑتا ہوں جب میرے دل کی بات ہونٹوں تک آ گئی تھی۔ اس واقعہ کے چند دن بعد میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھلی سڑک پر یوں ہی بے مقصد گھوم رہا تھا کہ ناصر بھائی رکشہ پر جاتے دکھائی دیے۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے ہیں......شاید نسرین آپا سے بھی بڑے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے رکشہ رکوایا اور مجھے پاس بلا کر ڈانٹنے لگے اور میں ایک ایسے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا جسے عدالت میں سزا سنائی جا رہی ہو۔ انہوں نے بتایا کہ نسرین آپا مجھ سے بے حد خفا ہیں۔ اور میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں کافی دیر تک خود کو الفاظ کی صلیب پر ٹنگا محسوس کرتا رہا اور اپنی اس غلطی پر ہی دل میں پچھتاتا رہا جس نے محبت کی ڈور کو ہمیشہ کے لیے کاٹ دیا تھا۔

لیکن غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے۔ یہ مشت خاک تو خطاونسیاں کا پتلا ہے۔ سنا ہے خدا بھی تین غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔ لیکن نسرین آپا نے تو جیسے محبتوں کے سارے دروازے میرے اوپر بند کر دیے تھے۔ ان کی آنکھوں میں لہراتی ہوئی مسکراہٹ سے میں ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا تھا۔ وہ میٹھی اور پیاری زبان اپنی ساری مٹھاس کھو بیٹھی تھی اور میں مہینوں ان کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا۔ ان کے گھر جانا تو درکنار اب میں ان جگہوں پر بھی جانے سے گریز کرنے لگا جہاں ان کی موجودگی کا شبہ ہو۔ لیکن یہ آنکھ مچولی آخر کب تک چلتی؟ آخر ایک دن سامنا ہو ہی گیا۔ میں ناصر بھائی کے یہاں بیٹھا ان کی امی سے گفتگو کر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے بعد نسرین آپا کا مسکراتا ہوا چہرہ دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ لیکن جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، ان کے چہرے پر ایک منجمد سی سنجیدگی طاری ہو گئی۔ میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ ناصر بھائی کی امی نے لپک کر ان کا استقبال کیا اور مجھے ایسا لگا گویا وہاں پر میرا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا ہے اور میں شرمندہ سا وہاں سے اٹھ گیا۔

محبتوں کے پھول شاید کبھی نہیں مرجھاتے...... شفقتوں کا سمندر کبھی خشک نہیں ہوتا۔ میں اسی امید پر یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ شاید کبھی نسرین آپا میری غلطی کو معاف کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں، اسی وقت سے جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ ان کی شادی تو اسی وقت ہو گئی تھی جب میں شادی کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھا لیکن بدلتے موسموں کا اثر ان پر ذرا بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ آج بھی اسی طرح ہنستی مسکراتی اور زندگی سے بھرپور نظر آتی ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ صرف ایک میری ذات ایسی تھی جس کے سامنے ان کے لب سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ میرے دل میں اکثر یہ خواہش سر اٹھاتی کہ چل کر ان سے اپنی خطا کی معافی مانگ لوں، لیکن میرے قدم بار بار ان کے گھر کی جانب اٹھ کر لوٹ آتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پیروں میں کوئی زنجیر سی پڑ گئی ہو۔ دھیرے دھیرے

امیدوں کے سارے پھول مرجھا گئے۔ اور وقت فاصلہ بن کر مجھے ان سے دور کرتا گیا۔

پھر نسرین آپا کے ابا کا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا اور وہ ان کے ساتھ اس نئے شہر کو چلی گئیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو، اب اور زیادہ نفرتوں کا زہر نہیں پینا پڑے گا لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ سارے راستے گھوم پھر کر پھر ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ میرا انٹرویو تھا اور اتفاق سے اسی شہر میں تھا جہاں نسرین آپا رہتی تھیں۔ کئی بار سوچا کہ نہ جاؤں، لیکن پھر نوکری حاصل کرنے کا یہ سنہرا موقع ہاتھ نہ آتا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میرا تقرر وہاں ہو جائے گا اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اسی دن میرے خالہ زاد بھائی اصغر کو بھی وہیں جانا تھا۔ وہ اپنی کار پر جا رہا تھا۔ اصغر میرا بھائی بھی ہے اور دوست بھی۔ اس نے کبھی بھی مجھ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس میں اور مجھ میں دو طبقوں کا فرق ہے۔ اس نے مجھے اپنی کار میں چلنے کی دعوت دی، جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ ارادہ تھا کہ شہر پہنچ کر میں کسی ہوٹل میں اُتر جاؤں گا اور اصغر نسرین آپا کے یہاں چلا جائے گا لیکن راستے ہی میں میری طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ اصغر کا خیال تھا کہ ایسی حالت میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں، لیکن نسرین آپا کی نفرت انگیز نگاہوں کا تصور کر کے میں وہاں جانے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر اصغر مجھے اس حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کار کا رخ نسرین آپا کے گھر کی طرف موڑ دیا۔

کار جب نسرین آپا کے دروازے پر پہنچی تو ہارن کی آواز سن کر ایک مسکراتا ہوا چہرہ بالکنی سے جھانکنے لگا۔ یہ چہرہ نسرین آپا کا تھا۔ لیکن جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، وہ مسکراتا ہوا چہرہ بالکنی سے غائب ہو گیا۔ اب میرے لیے وہاں ایک منٹ بھی رکنا ناممکن تھا۔ اصغر کے ہزار روکنے کے باوجود میں نے ایک رکشہ لیا اور ایک ہوٹل میں جا پہنچا اور بے سدھ سا ہوٹل کے کمرے میں پڑ رہا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ اصغر تھا۔ کہنے لگا۔

"میں تو تمہیں ہوٹلوں میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ نسرین آپا مجھ سے خفا ہیں۔ تم ایسے چلے آئے۔ کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ تو گھر آئے دشمن کا بھی استقبال کرتے ہیں۔ میرے ساتھ چلو۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"

اس وقت میرا جسم بخار کی حدت سے تپ رہا تھا، لیکن میرے لب خود بخود مسکرا اُٹھے اور میری نگاہوں کے سامنے امیدوں کے ہزار ہا ہزار چراغ روشن ہو گئے۔ آخر کار ان کا دل پگھل ہی گیا۔ وہ ہیں بھی تو بہت پیاری سی۔ اور میں فوراً اصغر کے ساتھ ہو لیا۔ ٹوٹی ہوئی ڈور کو جوڑنے کا اس سے اچھا موقع پھر ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن جب میں اس کے گھر پہنچا تو پھر وہی برفیلی خاموشی میرے جذبات پر تلوار بن کر گری۔ انہوں نے مجھے بالکل مہمانوں کی طرح رکھا، کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی، لیکن ان کے لب کبھی میرے سامنے وا نہیں ہوئے۔ میں اندر ہی اندر گھٹتا رہا اور جلد صحت یاب ہونے کی دعائیں مانگتا رہا تاکہ اس خاموشی کے عذاب سے چھٹکارا ملے۔ چند دنوں بعد میں ٹھیک ہو گیا لیکن دل پر ایک تازہ زخم لیے واپس آ گیا۔ بیماری کے سبب میں انٹرویو بھی نہیں دے سکا۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا اب نسرین آپا مجھ سے کبھی بات نہیں کریں گی۔ کیا ان کی شفقت سے میں ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہوں؟ یہ خیال ہی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر یہی سچ ہے۔

سنتے ہیں کہ تلوار کا زخم تو سوکھ سکتا ہے، لیکن زبان کا نہیں۔ یہی بھول میں نے کی تھی۔ نسرین آپا نے جب اسلم بھائی سے طلاق لی تو میں نے کسی سے صرف اتنا کہا تھا:

"اچھا ہوا کہ انہوں نے ایک جال سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ جو شخص اپنی شریک حیات کو زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتا اس کے ساتھ زندگی کے سنہرے ایام برباد کرنا کیا معنی

رکھتا ہے۔" اور جب یہ بات جب ان کے کانوں تک پہنچی تو وہ چراغ پا ہو گئیں۔ آخر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی نجی زندگی میں دخل انداز ہونے کا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے انہیں اپنی سگی بہن سے بڑھ کر سمجھا تھا، لیکن وہ تو مجھے اپنا سگا بھائی نہیں سمجھتی تھیں ورنہ شاید کبھی کا مجھے معاف کر چکی ہوتیں۔ پتہ نہیں میری زندگی میں وہ مبارک لمحہ کب آئے گا جب نسرین آپا کی آنکھوں میں میرے لیے محبتوں کے چشمے پھوٹیں گے۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔

☆☆☆

ڈور

ابھی ابھی جب میں یونیورسیٹی جارہا تھا تو راستے میں مجھے شاکر مل گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور نہ ہی ہمیشہ کی طرح اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

’’پروین آپا اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہیں۔‘‘

’’میں اس کی بات سن کر بس خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کی بات فوراً نہیں سمجھ سکا تھا۔

اتنی اہم بات، اتنے سیدھے طریقے سے، بغیر تمہید کے کہہ دینا مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے خاندان میں، دور یا نزدیک، کبھی کوئی طلاق کا معاملہ سامنے آیا ہو۔ رودھو کر زندگی جیسے تیسے گزر ہی جاتی ہے۔ اور یوں بھی اتنی بڑی تہمت برداشت کرنے کی ہمت بھی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ یا شاید اتنا بڑا قدم اُٹھانا، یوں ایک جھٹکے سے تمام بیڑیوں کو توڑ دینا سب کے بس کی بات نہیں......اور یہی وجہ ہے کہ شاکر کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن لینے کے بعد بھی میں اس کی طرف صرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس نے پھر کہا۔

’’سنا نہیں آپ نے؟ پروین آپا اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہیں۔‘‘ اور میری نگاہوں کے سامنے پروین آپا گھوم گئیں......پیاری پیاری سی پروین آپا۔ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ میں اکثر سوچتا......کاش! وہ میری سگی بہن ہوتیں......بالکل اپنی......لیکن کیا وہ اپنوں سے کم تھیں؟ کبھی

کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ بن جاؤں......کلکاریاں مارتا ہوا اور وہ مجھے اپنی گود میں اُٹھا کر پیار کریں۔ ویسے بھی میں جب ان کے سامنے جاتا تو خود کو ایک چھوٹا سا......معصوم بچہ تصور کرنے لگتا۔ کتنی مامتا تھی ان کی نیلی آنکھوں میں......گویا پیار کا ساگر لہریں مار رہا ہو۔

ایک چھوٹا سا گھر...... یہ پروین آپا کا گھر تھا......جو دلی میں تھا اور جسے اب وہ چھوڑ چکی تھیں۔ میں ان کے دروازے پر کال بیل بجائی۔ دروازہ کھلا اور پروین آپا مسکراتا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں کسی دوسری جگہ ٹھہرا ہوتا تو بھی ملنے پر وہ مجھے اسی طرح مسکرا کر دیکھتیں جیسے شکایت کر رہی ہوں۔ انہیں تو بس مسکرانا آتا تھا۔ خواہ کسی پر غصہ آئے یا کسی سے شکایت ہو، کچھ کہنے کے بجائے بس وہ ہولے سے مسکرا دیتی تھیں۔ دراصل یہ مسکراہٹ ہی ان کی زبان تھی، کیونکہ وہ بولتی بہت کم تھیں۔ کاش! میں ان کی اس مسکراہٹ کی زبان سمجھ سکتا۔ جامعہ نگر میں اپنے چھوٹے سے خوشنما گھر کے دروازے پر مجھے دیکھ کر اس وقت بھی بس وہ مسکرا دیں۔ اور جب میں راستے کی ساری تھکن غسل کے ذریعہ اُتار کر باہر نکلا تو وہ میرے لیے ٹیبل پر ناشتہ کی پلیٹیں سجا رہی تھیں۔ پھر وہ اپنے شہر کا حال پوچھتی رہیں اور میں ناشتہ کرتے ہوئے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

میرا ذہن دلّی میں گزارے ہوئے ایک ایک دن کو ترتیب وار میری نگاہوں کے سامنے سجا رہا ہے......جیسے کوئی کسی کتاب کے منتشر اوراق کو یکجا کر رہا ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں احمر بھائی کو جو یوں تو نہایت سنجیدہ اور بردبار نظر آتے......بڑی سلجھی ہوئی گفتگو کرتے مگر جب پروین آپا ان کے سامنے آتیں تو وہ چپ ہو جاتے......سہم سے جاتے۔ میں اس گھر کی ہر شے کو حیرت سے تکتا رہا۔ خوبصورت سجا ہوا بیڈروم مختصر سے دالان میں ڈائننگ ٹیبل، کنارے پر رکھا ہوا چھوٹا سا فریج، کچن میں گیس کا چولہا اور خوش نما دیدہ زیب کراکری۔ ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ، ریڈیوگرام......

سب ہی کچھ تو موجود تھا وہاں۔مگر پھر بھی سارا گھر شام کے سائے میں کھڑے ہوئے گرجا گھر کی طرح اداس اور مغموم دکھائی دیتا۔میں اکثر شام کے وقت گھر میں پھیلی ہوئی خاموشی سے گھبرا کر جمنا کنارے چلا جاتا اور وہاں کھڑے کھڑے پانی کی لہروں کی آواز سنتا رہتا اور لوگوں کو مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔یہاں تک کہ سورج جمنا کے دوسرے کنارے پر ڈوب جاتا اور جامعہ نگر کا سنسان علاقہ کچھ اور سنسان ہو جاتا۔تب میں واپسی کے لیے قدم اُٹھاتا۔پروین آپا ڈائننگ ٹیبل پر رات کا کھانا لگاتیں اور پھر ہم تینوں اس طرح چپ چاپ سر جھکائے اپنی اپنی قسمت کا لکھا حلق سے اُتارتے جیسے کسی کا سوگ منا رہے ہوں۔رات کچھ گہری ہو جاتی تو پروین آپا بی ایڈ کے امتحان کی تیاریاں کرتیں اور احمر بھائی ریڈیو گرام پر مہدی حسن کی غزلیں زور زور سے بجاتے۔ادھر جب پروین آپا کے کانوں میں آواز پہنچتی تو وہ جھنجھلا کر کتابیں پھینک دیتیں اور منھ لپیٹ کر سو جاتیں۔اُدھر جب احمر بھائی اپنے دفتر کا کام لے کر بیٹھتے تو پروین آپا اپنا ٹرانسسٹر کھول دیتیں اور احمر بھائی بس رحم طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے رہتے۔

شاکر جا چکا ہے اور میں سر جھکائے یونیورسٹی کی جانب بڑھتا جا رہا ہوں۔سڑک پر پتہ نہیں کتنے جانے انجانے چہرے نظر آ رہے ہیں مگر میری نگاہوں کے سامنے تو بس ایک ہی چہرہ ہے......پروین آپا کا چہرہ۔وہ چہرہ جس پر میں نے ہمیشہ مسکراہٹوں کے پھول کھلتے دیکھے تھے۔لیکن ان کے ساتھ ان کے گھر میں چند روز گزارنے کے بعد جیسے ان کی شخصیت تہہ در تہہ میری نگاہوں کے سامنے کھلتی چلی گئی۔میں نے دیکھا کہ وہ احمر بھائی کو......اپنے شوہر کو ......اپنے مجازی خدا کو ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتیں۔ان کا یہ اقدام کم از کم میرے لیے نا قابلِ برداشت تھا۔پتہ نہیں احمر بھائی اسے کس طرح برداشت کرتے تھے۔اکثر ایسا ہوتا کہ شام گئے جب ہر طرف اندھیرا چھا چکتا، وہ واپس آتیں۔یہ سارا وقت وہ یونیورسٹی لائبریری

میں گزارتیں۔میں سمجھ گیا کہ وہ اس گھر سے اور احمر بھائی دور دور رہنا چاہتی تھیں۔

میں سڑک پر چلا جا رہا ہوں۔میری دونوں طرف دکانیں ہی دکانیں ہیں مگر یہ سب میری نظر میں مجھے دھندلی سی دکھائی سی دکھائی دے رہی ہیں۔میری نگاہوں کے سامنے تو کناٹ سرکس کی دکانیں گھوم رہی ہیں جہاں پروین آپا میرے ساتھ گھوم گھوم کر بے مقصد وقت گزار رہی تھیں۔کبھی کسی بک اسٹال پر کوئی میگزین دیکھنے لگتیں......کبھی کسی ریستوراں میں بیٹھ کر ہم چائے پیتے۔جب میں انہیں واپس چلنے کے لیے کہتا تو وہ بس مسکرا دیتیں۔دراصل انہیں گھر واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔پھر ایک روز جب رات کے نو بجے ہم دونوں گھر لوٹے تو دیکھا کہ احمر بھائی سنسان سڑک پر تنہا ٹہل رہے تھے۔انہیں اس طرح ٹہلتے دیکھ کر پروین آپا کے چہرے پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ایسا لگا جیسے کوئی چوٹ کھائی ناگن اپنے شکار کو بے بس دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔انہیں اس طرح مسکراتے دیکھ کر میرے دل کے کسی گوشے میں......ایک لمحے کے لیے ہی سہی......نفرت سی جاگ اُٹھی۔میں نے ان سے اس طرح مسکرانے کا سبب پوچھا تو وہ بغیر کوئی جواب دیے بستر پر اوندھ گئیں اور میں خود کو چور محسوس کرنے لگا۔

سڑک پر گزرتی کسی کار کا ہارن تیزی سے بج اُٹھتا ہے اور میں چونک کر حال میں پلٹ آتا ہوں۔میں دلّی میں چند روز گزارنے کے بعد واپس آ گیا۔پھر خبر ملی کہ پروین آپا بھی دلّی چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی ہیں۔ان کے آنے کی خبر سن کر میں ان سے ملنے گیا۔مجھے دیکھ کر ان کی نیلی آنکھیں ہمیشہ کی طرح مسکرا اُٹھیں مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپی ہوئی اداسی گہن لگے چاند کی طرح دکھائی دے گئی۔

میں یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ کچھ دنوں یا کچھ ہفتوں کے لیے آئی ہوں گی مگر دن پر دن گزرتے چلے گئے......سورج نے مشرق سے لے کر مغرب تک نہ جانے کتنے چکر لگائے ......چاند گھٹ گھٹ کر بڑھتا رہا مگر وہ واپس نہ گئیں۔کبھی کبھی تو انہیں دیکھ کر مجھے ڈر سا لگنے

لگتا۔ان کی گردن پر اُبھری ہوئی نیلی رگوں کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے اُن کی روح پر کئی زہریلے ناگ لپٹ گئے ہوں۔ یہ اچانک انہیں کیا ہو گیا تھا۔احمر بھائی سے تو ان کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے تھے۔آخر انہوں نے یہ پندرہ سال کس طرح کاٹے؟ شاید ان کے اندر کوئی لاوا پک رہا تھا......جو دھیرے دھیرے سلگتا رہا......انہیں سلگاتا رہا اور اب اچانک پھٹ پڑا تھا۔میں سوچتا ہوں کہ انہوں نے جو فیصلہ اب کیا وہ پہلے بھی کر سکتی تھیں۔آخر وہ کون سی ڈور تھی جو انہیں احمر بھائی سے اتنے طویل عرصے تک باندھے رہی۔شاید یہ ڈور خاندانی روایات کی تھی لیکن جب ان کے برداشت کی حد ختم ہو گئی تو انہوں نے یہ ڈور ایک جھٹکے کے ساتھ توڑ دی۔

اور اب جب کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ پروین آپا احمر بھائی سے طلاق لے رہی ہیں تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہو رہا ہے۔دراصل اس سلسلے میں وہ حق بجانب ہیں۔جس وقت ان کی شادی ہوئی تھی اس وقت انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔احمر بھائی نے انہیں آگے کی تعلیم دلوائی۔انہیں ایم اے کروایا۔بی ایڈ کی ڈگری دلوائی۔احمر بھائی نے انہیں سب کچھ دیا مگر ایک چیز نہ سکے......وہ چیز جو ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔

وہ ان کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ نہ دے سکے۔

☆☆☆

الیوژن

گاؤں کی پگڈنڈیاں طے کرتے ہوئے اب وہ دونوں شہر جانے والی سڑک کے قریب آ گئے تھے۔ابھی اندھیرا تھا اور تھوڑے فاصلے پر واقع لائین ہوٹل صاف صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔البتہ وہاں پر کھڑے ٹرکوں کے دھندلے دھندلے سائے نظر آ رہے تھے۔وقفے وقفے سے کوئی گاڑی گزرتی تو سڑک روشن ہو جاتی اور آس پاس کی چیزیں دکھائی دینے لگتیں۔جب وہ پکی سڑک پر آ گئے تو اپنی اپنی دھوتیاں اُتار کر سروں پر ڈال لیں،لوٹے کو بائیں جانب رکھا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

''او سامنے والا گاؤں میاں لوگ کا ہے نا؟''

''ہاں! بڑا بھاری گاؤں ہے۔''

''او ہی تو! کل سام کو بس سے اترا تو میاں جی اللہ اللہ پکار رہا تھا۔''

''کیا کریں، سالا روج پانچ وکھت کا یہی دھندا ہے۔اور ابھیو تھوڑی دیر میں پکارے گا۔''

''تم لوگ کو ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر، کاہے کا ڈر؟''

''ارے سب سالے آتنک وادی ہوتے ہیں۔'' دیکھا نہیں،کبھی دلی،کبھی ممبئی...... جب نہ تب کچھ نہ کچھ ہوتے رہتا ہے۔''

''ہاں! مگر مارا بھی تو جاتا ہے۔''

''اک کے بار کا ہے نہیں سب کو مار دیتا ہے؟''

''اتنا آسان نہیں ہے نا! اب دیکھونا، اپنے ہی لوگوں کو پکڑ لیا۔کوئی کوئی پولس والا بھی سالا چوتیا ہوتا ہے۔یہی سب گلت سلت کام کرتا رہتا ہے۔''

''مگر اولوگ کے کھلاپھ ثبوتو مل گیا۔''

''کیا کریں؟ کھالی مارے کھاتے رہیں۔کوئی جواب دینے والا بھی تو ہونا چاہئے۔دوّ طرپھ سے ہوگا تو ٹھیک ہوگا نہیں تو ہمیسہ ڈر بنا رہے گا کہ کب سالا بجار میں دھما کہ ہوجائے، کب گاڑی اُڑ جائے......کب کیا ہوجائے......کب کیا ہوجائے......''

اچانک پورب سے تیز ہوا کا ایک جھونکا دونوں کی چوتڑوں کو سہلاتا ہوا گذر گیا۔اتنی دیر میں وہ فارغ ہو چکے تھے۔لوٹے کے پانی کو اپنے اپنے مقعد میں چھڑک کر دونوں کھڑے ہوگئے اور سر سے دھوتی اُتار کر پہن لی۔ پھر سڑک کے کنارے کی مٹّی پر ہاتھ رگڑا اور بچے کھچے پانی سے ہاتھ دھو کر کھڑے ہو گئے۔ملگجا سا اندھیرا اب تک قائم تھا۔اسی وقت سامنے والے گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز اُبھری۔دونوں خاموش ہو گئے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔

''او گاؤں میں مدرسہ بھی ہوگا؟''

''ہاں ہے تو؟''

''وہیں تو سب سالا آتنک وادی بنتا ہے۔مدرسہ کا ہے کو ہے، ہتھیار کا بھنڈار ہے بھنڈار۔''

''ہاں! اور او سب لوگ داڑھی کیسا رکھتا ہے، دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔''

''داڑھی تو سردار لوگ بھی رکھتا ہے اور ہم لوگ بھی۔''

''سردار لوگ کا بات اور ہے۔اولوگ بڑا سریا کے اور کنگھی کر کے رکھتا ہے۔دیکھنے میں اچھا لگتا ہے اور ای لوگ تو اتّی لمبی لمبی داڑھی، اوپر سے گندی، پتہ نہیں کتنی جوئیاں بھری ہونگی۔دیکھتے ہو طالبان لوگ کو ٹی وی پر؟ کیسا ڈینجرس لگتا ہے دیکھنے میں؟''

''ہاں! اور جنانی لوگ جو بُرکا پہنتی ہے۔نام ہے بُرکا اور رکھے ہے سر پر۔پتہ نہیں اس کے اندر کیا کیا چھپا کے رکھتی ہے۔''

''ہاں! اسی لیے تو جج صاحب بولے کہ اپنے ایہاں طالبان نہیں چاہیے۔''

''ٹھیک بولے۔ایسا ایسا جج ہر نیالے میں ہونا چاہئے، تبھی ہم لوگ کو نیائے ملے گا۔''

''مگر بعد میں اومیاں لوگ سے ماپھی مانگ لیہن۔''

''ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا......کھیر......''

اسی وقت ان میں سے ایک کی نظر سامنے والے گاؤں کی طرف اُٹھی۔

''ارے! دیکھ دیکھ کون جا رہا ہے۔''

''ای تو کوئی آتنک وادی دکھائی دیتا ہے۔''

''ہاں! طالبان لوگ کی طرح سر پر پگّڑ باندھے ہوئے ہوئے ہے۔اور یہ لمبی داڑھی بھی ہے اور کندھے پر بندوق......ارے باپ رے باپ۔اور دیکھو دیکھو ایک ٹھو کتا بھی لیے جا رہا ہے۔''

''ارے ہاں! کتّا بڑا کالا کتا ہے۔''

''مگر میاں لوگ تو کتا نہیں پالتا۔''

''ارے جاسوسی والا کتا ہوگا، جیسا پولس والے سب کے پاس ہوتا ہے۔''

''مگر ای سویرے سویرے جا کہاں رہا ہے؟''

”آگے ایک اور گاؤں میاں لوگ کا ہے۔اندر ہی اندر کچھ ہو رہا ہوگا۔“

”اور ایہاں سے بارڈر بھی جادے دور نہیں ہے۔کیا پتہ بارڈر کراس کر کے آتا جاتا ہوگا۔“

”ہوسکتا ہے۔“

اچانک وہ شخص سڑک کی جانب مڑ گیا۔دونوں سہم سے گئے اور دم سادھے بیٹھے رہے۔وہ شخص قریب آتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اُجالا پھیلتا چلا گیا۔کھیتوں سے ہوتے ہوئے جب وہ سڑک پر نمودار ہوا تو زمین پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔

”ارے!ای تو پھجلو میاں ہے۔“

”کون پھجلو میاں؟“

”ای سامنے والے گاؤں میں رہے ہے۔کھیت جوتے ہے اور بکری بیچے ہے۔ارے دیکھ کندھے پر تو ہل ہے اور ای کتا ای تو پھجلو میاں کی بکری ہے۔“

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ آتنک وادی......!“

”کیا کریں بھیا!روج دن ٹی وی دیکھ دیکھ کے،سن سن کے ایسا ہی لگتا ہے کہ سب سالے آتنک وادی ہیں۔“

☆☆☆

آئینہ

رات نہ جانے کتنی بیت چکی تھی۔خواب گاہ میں نائٹ بلب کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔اس کے پاس ہی اس کا شوہر گہری نیند میں ڈوبا پڑا تھا۔مگر اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔اس کی آنکھیں تو آنسوؤں سے بھری تھیں، بھلا ان میں نیند کہاں سے سماتی۔ وہ رو رہی تھی اور آنسو قطروں کی شکل میں اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے،مگر ہونٹوں سے کوئی آہ نہیں نکل رہی تھی۔نہ ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں اور نہ ہی سسکیاں۔بس آنسو تھے کہ نکلتے چلے جا رہے تھے۔برسوں سے جن آنسوؤں کو اس نے جوڑ جوڑ کر رکھا تھا وہ آج بے دریغ خرچ ہوئے جا رہے تھے۔وہ کبھی روئی بھی تو نہیں تھی کیونکہ اس کے نزدیک زندگی صرف ہنسنے ہنسانے کا نام تھی۔مگر آج گڈو کی ایک بات نے اسے اس طرح رونے پر مجبور کر دیا تھا۔وہ روئے جا رہی تھی اور اس کا ذہن ماضی کے واقعات دہراتا جا رہا تھا۔اسے یاد آیا...... جب وہ چھوٹی سی تھی...... بالکل گڑیا جیسی......تو اس کے پاپا اسے کتنا پیار کرتے تھے۔اس کے پھولے پھولے گالوں کو پکڑ کر زور سے بھینچتے۔اسے پاپا کی یہ حرکت قطعی ناپسند تھی۔وہ زور سے چلاتی اور اس کے پاپا کا قہقہہ سارے کمرے میں گونج جاتا۔پاپا کی یاد آتے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سی سسکی نکلی لیکن اس نے فوراً اس پر قابو پالیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے رونے کی آواز سن کر اس کے شوہر کی آنکھ کھل جائے اور وہ اُٹھ کر اس پر برس پڑے۔

وہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔سب سے بڑی حمیدہ آپا،ان کے بعد رحمت بھائی، پھر ارشد بھائی۔اسے اس بات پر ناز تھا کہ اس کے پاپا سب سے زیادہ اسے ہی

چاہتے ہیں۔ چھ آدمیوں کا یہ خاندان اپنی دنیا میں مگن تھا۔ وقت کا پرندہ پر لگا کر اُڑتا رہا اور پھر ایک دن گھر میں دبا دبا سا شور اُبھرا۔ حمیدہ آپا نے کسی کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا اور اب وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اسے بہت خوشی ہوئی۔ اس کی آپا دلہن بنیں گی۔ دولہا بھائی آئیں گے۔ بارات سجے گی۔ شہنائی بجے گی۔ خوب دھوم مچے گی۔ لیکن اس کے پاپا اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھے۔ اس نے حمیدہ آپا سے اپنے ہونے والے دولہے بھائی کے بارے میں پوچھنا چاہا مگر انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ کئی روز تک گھر میں سرد جنگ چلتی رہی۔ آپا نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور ایک کمرے میں بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ اس کے پاپا بے حد پریشان تھے اور ممی کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ آخر کار اس کے پاپا نے ہتھیار ڈال دیے۔ گھر کی روٹھی ہوئی بہار دوبارہ لوٹ آئی۔ خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ دیگیں چڑھیں، مہمان آئے، برات سجی اور جب اس نے دولہے بھائی کو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ لمبا قد، گٹھا ہوا جسم، گیہواں رنگ، بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں، ستواں ناک اور گھنی گھنی مونچھیں۔ اسے آپا کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ واقعی آپا گوہر شناس تھیں۔ ایسا قیمتی ہیرا چُنا تھا اپنے لیے کہ نگاہیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ اس نے دولہا بھائی سے خوب خوب مذاق کیا۔ دولہا بھائی نے بھی اس کے مذاق کا جواب مذاق سے دیا۔ یہ پہلی چوٹ تھی جو اس کے کنوارے دل پر لگی۔

جس سال حمیدہ آپا کی شادی ہوئی تھی، وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی اور ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتی تھی۔ لہٰذا جب اس کے امتحانات قریب آئے تو وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی پڑھائی میں جٹ گئی۔ اس نے فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے دولہا بھائی خاص طور پر اسے مبارکباد دینے آئے۔ اسے ان کی یہ ادا بہت اچھی لگی۔

ایک سال بعد جب آپا کی گود میں گڈو آیا تو اس کی سوئی ہوئی تمنّائیں پھر جاگ

پڑیں۔ اب وہ پہلے کی طرح شوخ، چنچل اور الہڑ دوشیزہ نہ تھی بلکہ سترہ سال کی ایک ایسی لڑکی تھی جو شب و روز کے نرم ریشوں سے خوبصورت خواب بُننے میں لگی رہتی۔ اسے اپنے مستقبل کی بڑی فکر تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ شادی کر کے کسی کا گھر نہیں بسانا چاہتی تھی بلکہ وہ شہرت کی بلندیوں پر اُڑنا چاہتی تھی۔ اس کے دولہا بھائی یعنی اکرام صاحب ایک کالج میں لیکچرار تھے۔ وہ افسانے بھی لکھتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ رسالوں میں ان کا نام چھپتا اور ان کی تصویریں شایع ہوتیں۔ اس کی نگاہوں میں یہ سب خوشنما خواب معلوم ہوتا۔ وہ سوچتی، کاش! اس کا نام بھی رسالوں کی زینت بنتا۔ اس کی تصویریں بھی رسالوں میں چھپتیں۔ اور تب اس نے اپنا پہلا افسانہ لکھا اور ایک دفعہ جب اکرم صاحب آئے تو اس نے انہیں گھیر گھار کر اپنا افسانہ سنا ہی دیا۔ اکرم صاحب اس کا افسانہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ خوب خوب شاباشی دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ پیشن گوئی بھی کر دی کہ ایک دن وہ ملک کی نامور ادیبہ بنے گی۔ اس کے خوابوں کو ایک سہارا مل گیا۔ اب وہ روز اکرم صاحب کا انتظار کرتی۔ وہ آتے تو گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتی اور ان کی سحر زدہ شخصیت میں کھو کر رہ جاتی۔ اسی زمانے میں پنکی پیدا ہوئی۔ اب تک وہ انٹر پاس کر چکی تھی اور بی اے میں داخلہ لینے والی تھی۔ ایک دن اکرم صاحب آئے تو انہوں نے ممی سے کہا۔

’’رشیدہ کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ وہاں شہناز اکیلی ہیں۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ وہاں سے ان کا کالج بھی نزدیک ہے۔‘‘ اور اس طرح وہ اپنے دولہا بھائی کے ساتھ ان کے گھر آ گئی۔

اب وہ اٹھارہ سال کی ایک ایسی نوجوان لڑکی تھی جس کا دل کسی کی چاہت کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔ یہ عمر بڑی ہی خطرناک ہوتی ہے۔ ہر وقت آگ سے کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔ اس عمر کی لڑکی ایسی بیل کی مانند ہوتی ہے جو اپنے قریب آنے والے ہر سہارے کو قبول کر

لیتی ہے۔رشیدہ بھی دھیرے دھیرے اکرم صاحب کے قریب آنے لگی۔اکرم صاحب نے دانہ ودام پھیلا دیا تھااور اب چڑیا خود پھنسنے کو تیار تھی۔رشیدہ کے ہونٹ اکرم صاحب کی امانت بن گئے۔اس کے جسم کے نشیب وفراز پراکرم صاحب کی انگلیاں اس طرح پھسلتیں گویا وہ کوئی من پسند ساز بجا رہے ہوں۔رشیدہ کی نس نس میں مستی کی لہر دوڑ جاتی۔مگر وہ جلد ہی سنبھل جاتی اور جب اکرم صاحب حد سے تجاوز کرنے لگتے تو وہ انہیں روک دیتی۔اکرم صاحب جھنجھلا جاتے۔ان کا نشہ اُکھڑنے لگتا اور وہ کسی ایسے شرابی کی طرح ہونٹ چبانے لگتے جس کے ہونٹوں تک بوتل آکر دور ہوگئی ہو۔لیکن آخر کب تک؟ جوانی کا دریا جب ایک دن چڑھا تو ساری رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے بہت آگے نکل گیا۔

انسان اپنے پاپ لاکھ چھپائے لیکن دیکھنے والی آنکھیں دیکھ ہی لیتی ہیں۔ایک دن حمیدہ نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔اس روز دونوں میاں بیوی میں زوروں کی لڑائی ہوئی۔اسے واپس گھر بھیج دیا گیا۔عام مردوں کی طرح اس کے پاپا بھی اس بات سے لاعلم رہے۔لیکن اس کی ممی نے اس کی کافی سرزنش کی۔اس کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔جب اسے اکرم صاحب کی یاد آتی تو اس کا سارا بدن سلگنے لگتا۔ایک ایک نس کھنچ جاتی۔ایسا لگتا کہ اس وینا کے تار اب ٹوٹے کہ تب ٹوٹے۔اس کے جلتے پیاسے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ جاتے۔سارے جسم میں جیسے کوئی پارہ سا چکر لگاتا رہتا......کبھی یہاں......کبھی وہاں اور وہ آبلہ پا سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔

پھر ایک روز ایک اور آفت آئی۔آپا اپنے دونوں بچوں کو لے کر واپس چلی آئی تھیں۔رشیدہ کے واپس آجانے کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر منہ مارنا شروع کر دیا تھا۔وہ اکرم صاحب کی حرکتوں سے تنگ آکر ان سے طلاق لینا چاہتی تھیں۔اس کے پاپا کو جب یہ معلوم ہوا تو

وہ اچانک بہت بوڑھے نظر آنے لگے۔ان کے ہونٹ تھرتھرائے اور انہوں نے صرف اتنا کہا۔

''میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔اسی لیے اس شادی پر رضامند نہیں تھا لیکن......''

وہ آپا سے کتراتی رہی لیکن ایک ہی گھر میں رہ کر کب تک چھپا جا سکتا تھا۔انہوں نے اسے دیکھ کر یوں نفرت اور حقارت کے ساتھ منھ پھیر لیا جیسے وہ اس کی سگی بہن نہیں،سوت ہو۔اس کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ کر رہ گیا۔مگر ساتھ ہی ساتھ ایک انجانی خوشی کا احساس اس کی رگ وپے میں دوڑ گیا۔اپنے اس جذبے کو وہ کوئی نام نہ دے سکی۔اسے لگا جیسے اب تک جو کچھ بھی ہوا سب غلط تھا۔رشتے تو آسمانوں میں طے ہوتے ہیں لیکن اس معاملے میں آسمان بھی کبھی کبھی غلطی کر جاتا ہے۔ٹیلیفون کے رانگ نمبر کی طرح یہاں بھی غلط کنکشن لگ جاتے ہیں۔پتہ نہیں غلطی حمیدہ کی تھی یا دولہا بھائی کی یا پھر اس کی جو وہ آپا کے بعد پیدا ہوئی۔اگر آپا کی جگہ وہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔اس نے تو اکرم صاحب کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔غلطی سراسر آپا کی تھی۔اکرم صاحب بار بار اس سے کہتے۔

''رشّو! کاش، میں نے تمہیں پہلے دیکھ لیا ہوتا۔'' لیکن قسمت دو مخالف سمتوں میں چلنے والے مسافروں کو تو یکجا کر دیتی ہے اور جنہیں ہمسفر ہونا چاہیے تھا وہ الگ راہوں کے مسافر بن کر رہ جاتے ہیں۔

ایک روز وہ کالج سے گھر واپس آ رہی تھی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔سامنے اکرم صاحب کھڑے تھے۔وہی اکرم صاحب......لانبے قد اور گھنی گھنی مونچھوں والے۔وہ مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

''رشّو! میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''مجھ سے؟'' وہ چونک پڑی۔

''ہاں، آؤ کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اور ہوٹل کے نیم تاریک، خنک اور رومانی کیبن میں بیٹھ کر انہوں نے اس سے ایک ایسی بات کہہ دی کہ اسے اپنا سارا وجود زندگی کے دوراہے پر کھڑا معلوم ہوا۔

''رشّو! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی؟'' اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے جھپکنا بھول گئیں۔

''ہاں ڈارلنگ! مجھ سے شادی کرلو۔ میں تمہارا کیریئر بنادوں گا۔''

اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ آج اسے پہلی بار اکرم صاحب سے شرم محسوس ہورہی تھی۔ اس کی پلکیں تھرتھرا کر اوپر اُٹھتیں اور پھر بارِ حیا سے نیچے جھک جاتیں۔ ایک دو لمحے کو اسے اپنے پاپا کا خیال آیا...... اپنی ممی، آپا اور بھائیوں کا خیال آیا۔ لیکن جوانی کا پُرجوش ریلا ان سارے چہروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اور اب اس کے سامنے صرف ایک چہرہ تھا...... اکرم صاحب کا چہرہ۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''تم چاہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تمہاری آپا مجھ سے طلاق لے چکی ہیں۔ اب میں آزاد ہوں۔ ہم دونوں آج ہی شادی کرلیں گے۔''

''آج؟'' وہ ایک بار پھر گھبرا گئی۔

''ہاں، بلکہ ابھی۔''

اور اس طرح وہ اپنے کالج سے سیدھے اکرم صاحب کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ اس بار نہ کوئی بارات آئی نہ شہنائیاں بجیں۔ دونوں نے کورٹ میرج کرلی تھی۔ اکرم صاحب نے اپنا پرانا ٹھکانہ بدل لیا تھا۔ نئے فلیٹ میں اُترتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اسے کوئی سلطنت مل گئی

ہو۔ اس کے دل میں دبا دبا سا خوف بھی اب نکل چکا تھا۔ اکرم صاحب کی مضبوط بانہیں اسے سہارا دینے کے لیے بے قرار تھیں۔ لیکن ابھی اسے ایک اور اگنی پریکشا سے گزرنا تھا۔ دلہن کی سیج پر جانے سے پہلے ہی پولیس انہیں تلاش کرتی ہوئی آ گئی۔ اکرم صاحب پر اغوا کا کیس دائر کردیا گیا تھا۔ اس کے پاپا نے تو ایسا کرنے کی کی مخالفت کی تھی مگر اس کے دونوں جوان بھائی اپنے خاندان کی بے عزتی برداشت نہ کرسکے تھے۔ اکرم صاحب نے پولیس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں لیکن پولیس والوں کے پاس ان کی ہر بات کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ جو کچھ بھی کہنا ہے عدالت میں کہنا۔ اور اس طرح پاپا کی شفقت آمیز گود میں کھیلنے والی رشّو حوالات میں پہنچ گئی۔ اسے دو دن اور دو راتیں حوالات میں گزارنا پڑیں۔ یہ دو دن اور دو راتیں اس پر قیامت بن کر گزریں۔ یہ پولیس والے کسی کے نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس کی روح کے ایک ایک تار کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور جب وہ حوالات سے باہر آئی تو اس کی ذات لخت لخت ہوکر بکھر چکی تھی۔ وہ اپنا آپ حوالات میں گم کر آئی تھی۔ اس کا گمان ٹوٹ چکا تھا۔ دو دن کے بعد ان کی ضمانت ہوگئی۔ معاملہ عدالت تک پہنچا اور عدالت نے ان دونوں کو میاں بیوی قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ اکرم کے دونوں بچے، گڈو اور پنکی بھی انہی کے ساتھ رہیں گے۔ اور اس طرح وہ وہیں جا پہنچی جہاں پہنچنے کا خیال بھی اسے بُرا لگتا تھا۔ اب وہ دو بچوں کی سوتیلی ماں اور خاتونِ خانہ تھی۔ اس کا سارا وقت گھر خانہ داری میں صرف ہونے لگا۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اکرم صاحب کی نگاہیں بھی بدلنے لگیں۔ رشیدہ کی حیثیت ان کی نظر چھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح ہوگئی تھی اور اب وہ تازہ گوشت کی تلاش میں رہنے لگے تھے۔ وہ سوچتی، کاش اسے پہلے عقل آ گئی ہوتی۔ اس نے ایک ایسے شخص پر کیسے اعتبار کرلیا جس نے پہلے اس کی بڑی بہن کو سبز باغ دکھائے، پھر اس پر ڈورے ڈالے اور ادھر ادھر بھی اپنی

ہوس کے جال پھیلائے مگر جب جوانی کا جوش سر چڑھ کر بولتا ہے تو پھر ہوش کی باتیں کہاں سوجھتی ہیں۔اب اس نے اپنی قسمت پر صبر کرلیا تھا۔

وقت کروٹیں بدلتا رہا اور رشیدہ ایک پیارے سے بچے کی ماں بن گئی۔اسے ایسا لگا جیسے بھٹکتی ہوئی کشتی کو ساحل مل گیا ہو۔وہ ہر وقت اپنے پپو میں مگن رہنے لگی۔اب اسے دنیا والوں کی پرواہ نہیں تھی۔کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔لیکن آج گڈو کی بات سن کر اس کے حواس جھنجھنا اُٹھے۔یہ چھوٹا سا بچہ اسے ایک ایسا آئینہ دکھا رہا تھا جس میں وہ اپنی شکل دیکھتے ہوئے ڈرتی تھی۔آج جب ڈرائنگ روم حسب معمول اکرم صاحب کے دوستوں سے بھرا قہقہوں سے گونج رہا تھا تو ان کے ایک بے تکلف دوست نے پیار سے گڈو کے کان اینٹھتے ہوئے کہا۔

’’سالا بالکل حرامی ہے۔‘‘ یہ سن کر گڈو کے چہرے کے عضلات تن گئے،آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے اور اس نے بہت تیز آواز میں پپو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’حرامی میں نہیں،حرامی تو پپو ہے۔‘‘

اس کا بوجھل ذہن اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔پپو اس کے نزدیک سویا پڑا تھا اور وہ اس کے چہرے پر اکرام صاحب کے نقوش ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

کالا تِل

نیلوفر کے نچلے ہونٹ پر ایک کالا تل تھا۔

دلہن بنی نیلوفر کے نچلے ہونٹ پر اُبھرے اس کالے تل کو اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے سہلاتے ہوئے ساجد کے جسم میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔اس نے اس کالے تل کو دھیرے سے چوم لیا۔

نیلوفر کا سارا جسم کپکپا اُٹھا۔ساجد کو محسوس ہوا گویا وہ کسی سیال مادے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ٹیسٹ ٹیوب کا قیف کمزور پڑتا جا رہا تھا۔اس نے نیلو کے کانپتے لرزتے،تھرتھراتے جسم کو زوروں سے بھینچ لیا۔نیلو کا پورا بدن آنچ دے رہا تھا۔ساجد کا سارا جسم نیلو کے بدن کی آنچ سے روشن ہوگیا اور وہ سرتا پا آگ بن گیا۔

اس وقت نیلو اپنے پورے بدن سے بول رہی تھی۔جسم کے ایک ایک راز کو دھیرے دھیرے کھول رہی تھی اور اس کے بھرپور کی خوشبو ساجد کی روح کا ایندھن بنتی جا رہی تھی۔مگر نیلو کے جسم کی ایک ایک عبارت پڑھ چکنے کے بعد اس کے بدن محل کے سب سے خطرناک اور حساس علاقے کی بدن بھر سیر کر لینے کے بعد اس کے طوفانی جذبوں میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔یونیورسیٹی کی مصروفیات اسے اُلجھائے رکھتیں۔

ساجد یونیورسیٹی میں لکچرر تھا۔ڈیوٹی کے اوقات کم تھے مگر اس کا زیادہ تر وقت یونیورسیٹی ہی میں گزرتا۔وہ ہمہ وقت لیباریٹری میں گھسا رہتا۔مختلف اقسام کی گیس،ان کے رنگ و بو،شیشے کے بنے ہوئے مختلف قسم کے آلات۔اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ حصول علم میں لگا دیا تھا مگر شادی کے بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دنیا کے تمام فنون،سارے علوم کا

سرچشمہ عورت کا جسم ہے اور یہ دنیا عورت کے حصول کے لیے ہی بنی ہے۔

پیریڈ ختم ہو چکا تھا مگر وہ اب تک دارالعمل میں مصروف تھا۔ چپراسی نے آ کر اطلاع دی۔

''سر! آپ کا فون ہے۔'' اس نے کام ادھورا چھوڑا اور فون تک آیا۔

''ہیلو! ساجد اسپیکینگ۔''

''میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے نیلو کی اٹھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں آتا ہوں۔''

جلدی آیئے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''تم کھالو۔ میں آ کر کھالوں گا۔''

''نہیں، میں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

''اچھا بابا! میں ابھی آتا ہوں۔''

اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ بہت زیادہ محبت کرنے والی بیوی بھی کبھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے۔ وہ اسکوٹر اسٹارٹ کر کے سیٹ پر بیٹھ چکا تھا کہ طارق اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''سر! پریکٹیکل بُک پر آپ کے دستخط......''

''کل گھر پر آ جانا۔ صبح آٹھ بجے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اسکوٹر آگے بڑھا دیا،

دوسری صبح دیوار گھڑی آٹھ بجا رہی تھی کہ کال بیل گنگنا اُٹھی۔

''ذرا دیکھنا تو کون ہے۔'' ساجد اس وقت غسل خانے میں تھا۔ اس نے وہیں سے نیلوفر کو آواز دی۔ نیلو نے دروازہ کھول دیا۔

''سر ہیں؟'' نیلو نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان دروازے پر کھڑا تھا۔

''نہا رہے ہیں۔ آپ بیٹھئے۔ وہ ابھی آتے ہیں۔'' وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ

گئی۔ طارق اندر داخل ہوا۔ ساجد غسل سے فارغ ہونے کے بعد کپڑے پہن کر ڈرائنگ روم میں آیا۔

''سوری، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' طارق نے بغیر کوئی جواب دیئے پریکٹیکل بک میز پر رکھ دی۔

''ذرا سنیئے تو......'' پردے کے پیچھے سے کھنکتی ہوئی آواز آئی تو ساجد معذرت کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔''

''گیس ختم ہوگئی ہے۔'' ڈرائنگ روم میں بیٹھے طارق کے کانوں تک آواز جا پہنچی۔

''لایئے سر! میں لا دیتا ہوں۔''

''مگر آج کل تو گیس کا بڑا کرائسس ہے۔''

''نو پرابلم سر! گیس ایجنسی والا میری جان پہچان کا ہے۔'' ساجد نے روپے نکال کر طارق کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ طارق ایک رکشہ بلا لایا۔

''کچن کدھر ہے؟'' اس نے براہ راست نیلو سے سوال کیا۔ نیلو نے کچن تک اس کی رہنمائی کی۔ ساجد ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس کی پریکٹیکل بُک پر دستخط کر رہا تھا۔

گیس آ گئی تو اسے طارق ہی نے فٹ کیا۔ ساجد کو سلنڈر میں ریگولیٹر لگانا نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیلو دو کپ چائے لے کر آ گئی۔ چائے کے ساتھ مٹھائیاں اور نمکین بھی تھے۔

''سر! کوئی اور کام؟''

''نہیں۔'' کہتے ہوئے ساجد اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اب یونیورسیٹی میں ملاقات ہوگی۔''

طارق کے جانے کے بعد نیلو بول اُٹھی۔

''اسٹوڈنٹ سے اس طرح کام کرواتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

''اس میں برائی ہی کیا ہے۔ جب میں اسٹوڈنٹ تھا تو اپنے استاد کے تھیلے ڈھویا کرتا تھا۔انہی کی دعاؤں کی بدولت میں آج اس مقام پر ہوں۔''

''کوئی نوکر کیوں نہیں رکھ لیتے؟''

''نوکر؟ نوکر آجکل ملتا کہاں ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اس پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔'' پھر وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور پھر میرے ہوتے ہوئے تمہیں بھلا کسی نوکر کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' وہ خفا ہو گئی۔اس کی چھوٹی سی خوبصورت ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

''آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں۔ایک پکچر تو دکھا نہیں سکتے۔

''ٹھیک ہے، چلیں گے کسی دن۔''

''کسی اور دن نہیں......آج چلیے۔''

نہیں آج نہیں۔میں طارق سے کہہ دوں گا۔وہ کسی دن ٹکٹیں لے آئے گا۔

''طارق سے کیوں؟''

''اب میں سنیما کی لائن میں کھڑا ہونے سے تو رہا۔''

طارق دوسرے ہی روز ٹکٹیں لے آیا۔نیلو نے اس دن چمپئی رنگ کی ساڑی زیب تن کی تھی۔شہابی رنگت والی عورتوں پر چمپئی رنگ خوب کھلتا ہے۔طارق اب تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔نیلو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ستائشی جذبات اُبھر آئے۔نیلو نے اپنے نچلے ہونٹ پر اُبھرے ہوئے کالے تل کو دانتوں سے دبالیا۔ساجد ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

''اچھا سر! اب میں چلوں؟''

''ٹھیک ہے۔کل آجانا۔وہی صبح آٹھ بجے۔''

طارق کے جانے کے بعد نیلو نے ساجد کی آنکھوں کے سامنے اپنی ساڑی کا پلّو لہراتے ہوئے خاموش آنکھوں سے پوچھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' مگر ساجد کی آنکھیں خاموش تھیں۔نیلو کو طارق کی بولتی ہوئی آنکھیں یاد آگئیں۔

ساجد کی بے اعتنائی پر نیلوفر کو غصہ آگیا۔آخر پوچھ ہی بیٹھی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''آں......ہاں......اچھی لگ رہی ہو۔'' ساجد نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ پر اس پر ڈالی۔اس کی آواز جذبات سے عاری تھی۔نیلو کو محسوس ہوا کہ شادی کے چند مہینوں بعد ہی اس کا جادو بدن ساجد کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔اس کا دل بجھ گیا۔

دونوں پکچر دیکھ کر لوٹے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔شہر کی سڑکیں سنسان ہو چلی تھیں مگر نیلو کے بدن میں بڑی ہلچل تھی۔اس نے جلدی سے کپڑے بدلے اور کچن میں گھس گئی۔ساجد کپڑے بدل کر نوٹس تیار کرنے لگا۔یونیورسٹی کے سالانہ امتحانات قریب تھے اور لڑکوں کا نصاب جلد از جلد مکمل کر لینا تھا۔کھانا تیار ہوا تو ساجد اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ بج گئے۔نیلو شب خوابی کا لباس پہن کر تیار تھی۔اس کی بدن بھر سپردگی میں کائنات کی تمام تر لذتیں اور سرمستیاں اسے نامعلوم انتہاؤں تک لے جانے کو تیار کھڑی تھیں مگر ساجد ان سے آنکھیں چراتے ہوئے بولا۔

''تم سو جاؤ۔میں کچھ نوٹس بنا رہا ہوں۔''

''چھوڑیے بھی۔نوٹس کل بنا لیجیے گا۔''

''نہیں، آج بنانا ضروری ہے۔تمہاری فلم کے چکر میں رہ گیا۔تم جا کر سو جاؤ۔''

نیلو نے اس کی پشت سے اپنی چھاتی چپکا دی۔ساجد کو گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔

''اچھا چلو......میں بس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔''

اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب ساجد خواب گاہ میں پہنچا تو نیلو سو چکی تھی......یا شاید جاگ رہی تھی۔ساجد نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔اسے بہت نیند آ رہی تھی۔

صبح آٹھ بجے کال بیل بجی۔دروازہ ساجد نے کھولا۔اس کا موڈ آف تھا۔

''کیا ہوا سر؟''

''آج نل نہیں کھلا۔غسل بھی نہیں کر سکا۔''

''میں ہینڈ پمپ سے لا دیتا ہوں۔''

''نہیں......نہیں......رہنے دو۔''

''اس میں بُرا کیا ہے سر؟ خلیفہ ہارون رشید کے شہزادے تو اپنے استاد کے پاؤں دھویا کرتے تھے۔''

نیلو دو خالی بالٹیاں ڈرائنگ روم کے دروازے پر رکھ گئی۔اس نے بغیر آستینوں والی نائٹی پہن رکھی تھی۔آنکھوں میں گذشتہ شب کی کچی نیند کا خمار تھا۔طارق بالٹیاں اُٹھانے کو جھکا تو اس کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ گر پڑا۔اس نے جلدی سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ساجد انجان بن کھڑا رہا۔گو کہ اسے سگریٹ سے شدید نفرت تھی۔

طارق یکے بعد دیگرے کئی بالٹیاں بھر گیا۔

''اب میں چلوں سر؟''

''ٹھیک ہے۔آج تو کچھ نہ ہو سکا۔کل آنا۔''

یونیورسیٹی کے سالانہ امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ساجد کی مشغولیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔اسے کنٹرولر آف اکزامینیشن کا اضافی چارج سونپ دیا گیا تھا۔وہ صبح نو بجے گھر سے نکلتا تو رات آٹھ بجے واپس ہوتا۔اس وقت تک وہ اس قدر تھک چکا ہوتا کہ نیلو کے آگ بدن کی آنچ اسے محسوس ہی نہیں ہوتی۔اس کے بدن کی ہر خواہش......خواہش کی ہر تشنگی نا آسودہ رہ جاتی۔کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی تو ساجد اس سے وعدہ کرتا کہ امتحانات ختم ہوتے ہی اسے پورا وقت دے گا۔

مگر جب امتحانات ختم ہوئے تو سائنس کانگریس کی طرف سے بلاوا آ گیا۔جس وقت اسے لیٹر ملا اس وقت طارق اس کے پاس ہی تھا۔اس نے خوش ہو کر طارق کو اطلاع دی۔

''بنگلور میں سے می نار ہے۔اٹھارہ سے پچیس تک۔وقت کم ہے۔پیپر تیار کرنے میں ذرا میری مدد کرنا۔بلکہ ابھی چلو میرے ساتھ۔دن کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔

گھر پہنچ کر جب اس نے نیلو کو سے می نار کی خبر سنائی تو اس نے طارق سے کہا۔

''ان سے کہیے انکار کر دیں۔بنگلور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں گھر میں اکیلی کیسے رہوں گی؟''

''اکیلی کہاں؟'' ساجد بول پڑا۔

''اڑوس پڑوس میں کئی لوگ ہیں اور پھر سجاد صاحب کی وائف ہیں جنہیں تم خالہ جان کہتی ہو۔''

''کون اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنے دنوں تک میرے ساتھ رہے گا؟''

تم کہہ کر تو دیکھو......اور پھر طارق ہیں۔'' پھر وہ طارق سے مخاطب ہو کر بولا۔''

''طارق! ذرا میرے پیچھے ان کا خیال رکھنا۔''

''کیوں نہیں سر! یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی۔''

ساجد نے کہا تھا کہ سے می نار ختم ہونے کے بعد وہ دو چار روز ور بنگلور میں رکے گا مگر سے می نار ختم ہوتے ہوتے اس کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ وہ پچیس تاریخ کی رات ہی کو واپس ہوگیا۔ اپنی واپسی کی خبر اس نے نیلو کو نہیں دی۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ بہت تھک چکا تھا اور اپنی ساری تھکن نیلو کے بدن میں اُتار دینا چاہتا تھا۔ نیلو کی جدائی نے اسے آتش چنار کی طرح سلگا دیا تھا۔ اسے اس کی بے حد یاد آرہی تھی۔ اس نے گھر سے روانہ ہوتے وقت بڑے پیار سے نیلو کے نچلے ہونٹ کے کالے تل کو بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان بوسوں کو کبھی ضائع ہونے مت دینا۔ میں واپس آکر وصل کے لمحوں میں انہیں وصول کروں گا۔ ان ہی خیالوں میں گم جب وہ گھر پہنچا تو دروازے باہر سے بند تھا۔ اس نے ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھولا۔ فرش پر بے ترتیبی سے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ تکیے کے پاس ایک رومال پڑا تھا جس کے ایک کونے پر انگریزی کا "T" لکھا ہوا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے یہ "T" نہیں ہے بلکہ ایک ایسی صلیب ہے جس پر اسے لٹکا دیا گیا ہے۔ اس کے اندر کا آتش چنار شدید برف باری میں چھپ گیا اور ایک ننھا سا کالا تل اس کے پورے وجود پر پھیل گیا۔

☆☆☆

پاپ کے پاؤں

اور جب رام جی سنہرے ہرن کے تعاقب میں روانہ ہوئے تو سیتا جی کی حفاظت کی ذمہ داری لکشمن کے سر پر آپڑی۔ مگر جب وہ کسی کام سے جانے لگے تو انہوں نے سیتا جی کے چاروں طرف لکشمن ریکھا کھینچ دی تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔ مگر راون ان سے زیادہ چالاک تھا اس نے سیتا جی کا ہرن کر لیا اور لکشمن روتے پیٹتے رہ گئے۔ لکشمن کو اس طرح روتا دیکھ کر ایک سادھو مہاراج نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو لکشمن بولے۔

’’وہ دشٹ راون میری بھابی کو ہرن کر کے لے گیا۔‘‘

’’تمہاری بھابھی کیسی تھیں مہاراج؟‘‘

سادھو نے پوچھا۔

’’پتہ نہیں، میں نے اب تک ان کے صرف پیر ہی دیکھے تھے۔‘‘

منداکنی کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر پرمود بے خود سا ہو کر رہ گیا۔ کمرے میں لڑکیوں کی سرگوشیوں اور دبی دبی مسکراہٹوں کے بیچ کسی نے اسے ٹھوکا دیا۔

’’کیوں پرمود بھیا، بھابی کیسی لگیں؟......‘‘

اور پرمود......اسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپسرا سرخ کپڑوں میں مبلوس اس کے سامنے آبیٹھی ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔

کاش! یہ منداکنی، یہ اپسرا اس کی بھابی نہ ہوتی بلکہ......اس کے آگے وہ کچھ اور نہ سوچ سکا۔ اس کی نگاہوں نے اس کی سوچ کے سلسلے کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس کی بیقرار

آنکھیں کبھی منداکنی کے ماتھے پر سجے ٹیکے میں اٹک جاتیں تو کبھی اس کے تھرتھراتے لب کو چوم لیتیں۔ کبھی منداکنی کی لونگ کا لشکارا اسے آنکھیں جھپکنے پر مجبور کر دیتا تو کبھی یہ آنکھیں اس کی بے داغ اور سفید گردن پر پھسلنے لگتیں اور جیوں جیوں اس کی نگاہیں بھٹکتی گئیں اسے اپنی روح کے اندر طلاطم کا احساس ہونے لگا۔ آخر اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے ہوش وحواس یکجا کیے اور بھابھی کو لڑکیوں کی جھرمٹ میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔

''کیوں پرمود میں اس ساڑی میں کیسی لگتی ہوں؟'' منداکنی اس کے سامنے ایک ادا سے کھڑی تھی۔ اس کا بایاں بازو ایک طرف پھیلا ہوا تھا۔ جس پر اس نے ساڑی کا پلو سنبھال رکھا تھا۔ اور پرمود کو اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''بہت خوبصورت، مگر آپ سے زیادہ نہیں......؟''

''چل ہٹ شریر کہیں کا۔'' منداکنی نے ایک ادا کے ساتھ کہا اور اس کی پیٹھ پر ایک ہلکی سی دھول جما دی۔

''بھابھی! بھیا اتنی رات گئے گھر لوٹتے ہیں، تمہیں ڈر نہیں لگتا۔''

''ڈر؟'' منداکنی ہنس پڑی ''ڈر کس بات کا تم جو رہتے ہو گھر پر۔''

''اور مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟'' پرمود نے کہنا چاہا مگر اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

''ایک بات کہوں۔'' منداکنی ستیش کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''اب پرمود کی شادی کر دینی چاہیے۔''

''پرمود کی شادی، مگر ابھی تو بالکل بچہ ہے۔''

ستیش ہنس پڑا۔

''اب وہ اتنا بچہ بھی نہیں رہا جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ستیش چونک پڑا۔

''مطلب یہ کہ اب وہ جوان ہو گیا ہے۔''

''تو کیا سبھی جوان لڑکوں کی شادی کر دینی چاہیے؟''

''نہیں مگر اس کی آنکھیں......''

''کیا ہوا اس کی آنکھوں کو؟''

''وہ مجھے کچھ عجیب نظروں سے گھورتا ہے، ایسی نظریں جن کا مطلب ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔'' منداکنی کے منہ سے یہ الفاظ کیا نکلے گویا تنی ہوئی کمان سے تیر چھوٹا اور ستیش کے دل میں پیوست ہو گیا۔

ابھیمنیو نے جب یہ چیلنج قبول کر لیا کہ وہ چکرویو سے نکل جائے گا تو لوگ بہت ہنسے اور اس طرح ابھیمنیو چکرویو میں پھنس کر رہ گیا۔ پرمود نے بھی بہت چاہا کہ وہ منداکنی کے سحر سے آزاد ہو جائے مگر وہ اس کے خیالوں میں کھوتا ہی چلا گیا، گم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا وجود صفر ہوتا ہوا محسوس ہوا اور وہ اس چکرویو میں بھٹکتا رہا۔

رجنی جب ستیش کے کمرے میں جھاڑو لگانے آئی تو تنہائی پا کر ستیش نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

رجنی گھبرا گئی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو پھڑپھڑائے لیکن ستیش کے ہونٹوں نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ کمرے کے باہر کھڑے پرمود نے جب یہ نظارہ دیکھا تو گھبرا کر مڑا اور منداکنی سے ٹکرا گیا۔ دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں اور جھک گئیں۔

پرمود منداکنی کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا، منداکنی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں

انگلیاں پھیر رہی تھی اور پرمود کی بانہیں منداکنی کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔اچانک پرمود آدھے دھڑ سے اٹھا اور منداکنی کے شہابی رخسار کو ہولے سے چوم لیا، منداکنی کے گال انگارہ ہو گئے۔ پھر منداکنی کا سر آگے کی طرف جھکتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے لب پرمود کے لب سے جا ملے۔ پرمود کی آنکھیں مندنے لگیں۔اچانک ایک کرخت آواز پرمود کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' دونوں چونک پڑے۔سامنے ستیش شعلہ بار نگاہوں سے دونوں کو گھور رہا تھا۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز بھری۔

''منداکنی......یہ تم نے کیا کیا......؟''

پرمود گھبرا گیا لیکن منداکنی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''ستیش نہ تم رام ہو، نہ میں سیتا تو پھر پرمود لکشمن بن کر کیوں رہتا۔''

☆☆☆

کھلونے

وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

آج پھر اس کا قلم غائب تھا۔ایک ادیب کے لیے اس کا قلم ہی تو سب کچھ ہے۔ ذہن میں خیالات کی یلغار ہو رہی ہو اور اگر ایسے میں قلم نہ ملے تو......

اس کی جھنجھلاہٹ بجا تھی۔اسے اپنے دونوں بیٹوں پر غصہ آ رہا تھا۔دونوں بڑے ہو گئے ہیں، باشعور ہیں......ایک کی عمر پندرہ برس ہے اور دوسرے کی سترہ برس، مگر چیزوں کو رکھنے کا سلیقہ اب تک نہ آیا۔دراصل دونوں بچپن سے ہی ایسے تھے۔ہر شے کو کھلونا بنا ڈالتے۔کبھی ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں کو زمین پر لٹا کر ریل گاڑی بنا دیتے۔کبھی صوفوں کو جوڑ کر گھر بناتے۔کبھی گھر کے سارے جوتوں اور چپلوں کو ڈرائنگ روم میں سجا دیتے۔وہ ان پر بگڑتا، انہیں ڈانٹتا، کبھی کبھی مار بھی بیٹھتا، مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے۔کبھی کبھی وہ انہیں پیار سے سمجھاتا، ''بیٹے! ہر چیز کھیلنے کی نہیں ہوتی۔'' لیکن وہ کچھ سنتے ہی نہ تھے۔ویسے ان کے پاس کھلونوں کی یا کھیل کے سامان کی کوئی کمی نہ تھی۔بیڈمنٹن سے لے کر کرکٹ تک کا سارا سامان موجود تھا۔مگر انہیں ہر شے کھلونا معلوم ہوتی تھی......خواہ وہ کتابیں ہوں یا قلم۔

جب وہ بڑے ہوئے تو ان کی شرارتوں کے انداز بھی بدلتے گئے۔ایک دن اس نے دیکھا کہ ٹیبل فین کھلا پڑا ہے اور اس کے دونوں لڑکے بڑے انہماک کے ساتھ اس کی مرمت کر رہے ہیں۔بعد میں اس پنکھے کو درست کروانے میں اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی تھی۔کبھی اسٹیبلائزر پر آفت آتی تو کبھی پورا ٹی وی سیٹ ہی کھلا ملتا۔وہ انہیں سمجھاتا......منع کرتا......مگر وہ

تو جیسے تہیہ کیے ہوئے تھے کہ سارے گھر کو تہس نہس کر کے ہی چھوڑیں گے۔

وہ جب ذرا بڑے ہوئے تو اکثر گھر سے غائب رہنے لگے۔ڈانٹنے، مارنے کی عمر تو کب کی گزر چکی تھی۔وہ کئی کئی دنوں تک دونوں کو نہ دیکھ پاتا۔اس کا آفس کافی دور تھا، لہٰذا وہ صبح آٹھ بجے ہی گھر سے نکل پڑتا تھا۔اس وقت تک دونوں سوئے پڑے رہتے تھے۔وہ رات کو لوٹتا تو معلوم ہوتا کہ وہ دونوں گھر سے باہر ہیں۔پتہ نہیں رات کو کس وقت ان کی واپسی ہوتی تھی۔

دراصل وہ اس نئی نسل سے ڈرنے لگا تھا۔کوئی بھی سخت بات کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ایک دو دفعہ اس کے کانوں میں شکایتیں بھی پہنچیں ان دنوں وہ اپنی جوانی سے کھیل رہے تھے۔اب وہ انہیں کیسے سمجھاتا کہ جوانی کھیلنے کے لیے نہیں ہوتی۔سنبھال کر رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔اگر کھیل کھیل میں اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔مگر المیہ تو یہ تھا کہ بچوں کی ڈور اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔وہ کھلے بندوں اِدھر اُدھر گھومتے اور وہ بے بس سا کھڑا انہیں دیکھتا رہتا۔اکثر اس کی ذاتی اشیاء غائب ہو جاتیں اور وہ جان کر انجان بن جاتا......سوچتا، کیا کہا جا سکتا ہے اُنہیں؟ اگر اُنہوں نے پلٹ کر جواب دے دیا تو......؟؟ ایک بڑا سوالیہ نشان اس کی نگاہوں کے آگے لہرا جاتا اور وہ خاموشی کے ساتھ سب کچھ سہہ جاتا۔مگر آج وہ سچ مچ جھنجھلا اُٹھا تھا۔اگر قلم نہ ملا تو اس کے ذہن کا لاوا باہر کیسے آئے گا؟ کہیں اندر ہی اندر ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑا تو......؟؟

وہ دونوں گھر سے غائب تھے۔اس نے سوچا کہ کہیں چائے خانے میں بیٹھے ہوں گے۔وہ اُٹھا اور بیٹوں کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔پورا کمرہ بے ترتیب تھا۔کتابیں اور کاپیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ایک طرف میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔پلنگ پر ایک ملگجی چادر شکنوں سے چور پڑی تھی۔اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔پھر اس نے قلم تلاش کرنا شروع کیا۔ہر جگہ

دیکھا مگر قلم کہیں نظر نہیں آیا۔پھر اُس نے تکیے کو اُٹھا کر دیکھا......اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کے دماغ میں زوروں کی سنسناہٹ ہونے لگی......سن......سن......سن، جیسے آندھی چل رہی ہو۔اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

تکیے کے نیچے اس کے لڑکوں کے کھلونے رکھے ہوئے تھے......دو چمکتے ہوئے ریوالور اور اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''بیٹے! ہر چیز کھیلنے کی نہیں ہوتی۔''

☆☆☆

مچھلی

مچھلی جل کی رانی ہے   جیون اس کا پانی ہے
ہاتھ لگاؤ گے ڈر جائے گی   باہر نکالو گے مر جائے گی

پانچ برس کی وہ معصوم سی بچی جھوم جھوم کر اپنا سبق دہرا رہی تھی۔ مطلب اور مفہوم سے بے خبر مچھلی اور جل کے تعلق سے بے نیاز، پانی اور جیون کے سمبندھوں سے انجان۔

”مچھلی جل کی رانی ہے۔“

”مچھلی جل کی......مچھلی......“

وہ خود بھی کسی مچھلی ہی کی طرح تھی۔ پھرتیلی تیز اور چالاک۔ کبھی گھر کے اس کونے میں تو کبھی اس کونے میں۔ ابھی یہاں تو ابھی وہاں۔ اس کا بدن بھی لچکیلا اور چمکدار تھا۔ وہ کسی کی گود میں ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ بار بار بام مچھلی کی طرح پھسل کر نیچے اُتر جاتی۔ اسی لیے لوگ اُسے پیار سے مچھلی رانی کہنے لگے تھے۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی مچھلی اور جل کا تعلق اس کی سمجھ میں آتا گیا۔ پانی اور جیون کے سمبندھوں کو وہ اچھی طرح سمجھنے لگی۔ اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو کالج پہنچی اور پھر وہاں سے یونیورسٹی۔ مگر زندگی کے ہر دور میں وہ بنیادی طور پر مچھلی ہی رہی۔ ویسی ہی چکنی اور لچکیلی، پھسل پھسل جانے والی مچھلی وہ آج تک کسی کی گرفت میں نہ آسکی تھی۔ نہ جانے کتنے مچھیروں نے اس پر جال ڈالے مگر وہ ہر بار بچ نکلتی۔ آخر ایک مچھیرا اُسے اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو

ہی گیا۔ وہ بڑا تیز اور ہوشیار مچھیرا تھا۔ مچھلی کو پتہ بھی نہ چلا اور وہ اس کے جال میں پھنس گئی۔

وشال اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ وجیہ اور خوبرو۔ مینو سے اس کی پہلی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ وشال نے اُسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ عورت حسّاس ہوتی ہے۔ جب کسی مرد کی گرم نگاہیں اس پر پڑتی ہیں تو اس میں ہلکا ہلکا کرنٹ دوڑنے لگتا ہے۔ مینو کو جب یہ کرنٹ لگا تو وہ چونک پڑی۔ وشال بھی اسے پہلے ہی نظر میں بھا گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں۔ عورت جب کسی مرد کو پسند کرنے لگتی ہے تو اس کے سامنے اپنی نظریں جھکا لیتی ہے اور پھر اپنی پسند کو دل کی نظروں سے دیکھنے لگتی ہے۔ وہ بھی اسے دل کی نظروں سے دیکھتی رہی، بار بار اس کے قریب آتی رہی۔ وشال کو بھی اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ مچھلی پھنس چکی ہے۔

تقریب ختم ہوگئی۔ مینو اور وشال اپنے اپنے گھروں کو رُخصت ہوگئے لیکن اس رات ان دونوں میں سے کسی کو بھی نیند نہ آسکی۔ دونوں کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کے سپنے دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور اُس دن وشال نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مینو کے گھر اپنا رشتہ بھیج دیا۔ لڑکا وجیہہ تھا، اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ جلد ہی باتیں طے ہوگئیں اور پھر وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

شادی کے بعد مینو کی دنیا وشال کے سینے میں سمٹ کر رہ گئی۔ اسے ایسا لگتا جیسے وہ ایک چھوٹی سی مچھلی ہے اور وشال کا سینہ ایک وشال ساگر۔ وہ اس ساگر میں خود کو گم کر دینا چاہتی تھی۔ وشال اس کا سب کچھ تھا اور وہ وشال کے لیے سب کچھ تھی۔ ان دونوں کے درمیان نہ کبھی تکرار ہوتی نہ لڑائی جھگڑا۔

وشال صبح آفس چلا جاتا اور شام گئے لوٹتا۔ مینو گھر کا چھوٹا موٹا کام نپٹاتی یا کبھی کوئی میگزین کھول کر بیٹھ جاتی۔ گھر میں کام بھی کچھ زیادہ نہ تھا اور پھر سکھیا جو تھی سارے کام کرنے

کے لیے۔ وہ دن بھر پڑی پڑی بور ہوتی رہتی تھی۔ ایسے میں جب کالج میں لیکچرارشپ کی جگہ مشتہر ہوئی تو وہ خود کو روک نہ سکی۔ وشال نے اسے منع کیا۔

''کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی؟ میں جو ہوں نا۔''

''نہیں وشال، نوکری صرف پیسے کمانے کے لیے نہیں کی جاتی۔ آخر میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اسے دوسروں میں بانٹ کر میں کتنا سکھ محسوس کروں گی یہ صرف میں ہی سمجھ سکتی ہوں اور پھر بےکار پڑے پڑے تو بڑی بڑی مشینیں بھی زنگ لگنے سے بےکار ہو جاتی ہیں۔

وشال لاجواب ہو گیا۔ مینو نے انٹرویو دیا اور کامیاب رہی اور لیکچرار کے عہدے پر فائز ہو گئی۔ مگر کام کاجی خاتون ہونے کے بعد بھی گھر ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ گھر اس کا مندر تھا اور وشال اس کا دیوتا۔ کالج میں وہ طلباء اور اساتذہ کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھی۔ اس کے رفقائے کار اس کی خوشگوار زندگی پر رشک کرتے اور اس کی مثالیں دیتے تھے۔

مگر پھر حالات اچانک بدل گئے۔ وہ کئی دنوں تک کالج نہیں آئی نہ ہی اس نے چھٹی کی کوئی درخواست دی۔ اس کی سہیلی سدھا جب اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر گئی تو گھر مقفل تھا۔ پاس پڑوس والوں سے بھی کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔ وہ لوٹ گئی۔

کالج کا سارا اسٹاف اس کے اس طرح غائب ہو جانے پر پریشان تھا۔ اچانک ایک دن پروفیسر ورما نے اسٹاف روم میں ایک دھماکہ کر دیا۔

''مینو پاگل ہو گئی ہے۔ آج کل وہ اپنے میکے میں ہے۔''

جس نے سنا وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ مینو اور پاگل؟ ناممکن۔ اتنی سلجھی ہوئی شخصیت، اتنی سنجیدہ اور سمجھدار ہستی اور پاگل؟ یہ کیسے ہو گیا؟ حقیقت سے وہ بھی بے خبر تھے۔ کوئی جواب نہ دے سکے۔ سدھا اس وقت اسٹاف روم کے ایک گوشے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ بھی ہکّا بکّا رہ گئی۔ اس نے اسی

وقت اپنی کرسی چھوڑ دی۔ بیگ اٹھایا اور مینو کے میکے جا پہنچی۔ مینو وہاں موجود تھی۔ مگر وہ پاگل تو نہیں لگ رہی تھی۔ ہاں بجھی بجھی اور اُداس ضرور تھی۔ سدھا کو ایسا لگا جیسے مچھلی کو کسی نے پانی سے باہر نکال کر چھوڑ دیا ہو اور وہ تڑپنے اور چھٹپٹانے کے بعد اب ساکت پڑی ہو۔ سدھا کا دل بھر آیا۔

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے تونے؟'' سدھا بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھی۔ مگر سدھا کے بار بار پوچھنے پر بھی مینو نے زبان نہیں کھولی۔ صرف اتنا کہا کہ وہ وشال کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی آئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اُس نے پھر کالج جوائن کر لیا۔ مگر اب وہ پہلے جیسی مینو نہیں رہی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ کبھی کبھی عجیب سی حرکتیں کرتی۔ ہر شخص اس کی ٹریجڈی سے واقف ہو چکا تھا اس لیے کالج کا پورا اسٹاف اس کے تئیں ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا۔ اس کی ذہنی حالت جیسی بھی رہی ہو وہ آج بھی ایک اچھی ٹیچر تھی۔ سدھا خاص طور سے اس کا خیال رکھتی تھی۔

ایک دن عجیب بات ہوئی۔ مینو سدھا کے ساتھ مارکیٹ گئی۔ وہاں کسی لڑکے نے اس کے ساتھ بدتمیزی کرنی چاہی بس پھر کیا تھا۔ اُس نے بھری سڑک پر اس لڑکے کا گریبان پکڑ لیا۔ اور زور زور سے چلّانے لگی۔

''خبیث، ذلیل، کیا سمجھتا ہے۔ چھیڑتا ہے۔ کٹوا کر پھینکوا دوں گی۔ پٹھان ٹولے کی ہوں پٹھان ٹولے کی۔''

لڑکا گریبان چھڑا کر بھاگ نکلا مگر سدھا ہکّا بکّا ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔ اتنی مہذب اور نرم خو عورت اور ایسے نازیبا کلمات۔ آخر جب اُس نے مینو کو پکڑ کر جھنجھوڑا تو جیسے وہ ہوش میں آ گئی ہو۔ سدھا اُسے گھر پہنچانے آئی۔ وہاں سدھا نے اُسے بہت کریدنا چاہا مگر وہ تو جیسے چپ کا تالا لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

ایک دن سدھا اس کے گھر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ مینو بڑے انہماک کے ساتھ سنز

اینڈ لورز پڑھ رہی تھی۔

’’یہ کیا پڑھ رہی ہو؟‘‘ سدھا کے پوچھنے پر جب اس نے نگاہیں اٹھائیں تو انھیں دیکھ کر سدھا کانپ سی گئی۔ عجیب وحشت زدہ نگاہیں تھیں وہ۔ سدھا اسے نارمل کرنے کے لیے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

’’کیا پڑھ رہی ہو مینو؟‘‘ اس بار مینو مسکرا پڑی۔

’’کچھ نہیں۔ ایسے ہی۔‘‘ کچھ دیر تک دونوں کے درمیان چپ کی چادر تنی رہی۔ پھر مینو خود ہی بول پڑھی۔

’’یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی سدھا نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ شاید اتنے عرصے سے جو لاوا اس کے دل میں پک رہا تھا اب اُبلنا چاہ رہا تھا۔ سدھا خود حقیقت جاننے کے لیے بے چین تھی۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو کا رُخ موڑ دیا اور جب اُسے یہ محسوس ہوا کہ مینو اب سب کچھ بتانے کو تیار ہے تو وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

’’اچھا اب بتا، تو وشال کو چھوڑ کر کیوں آ گئی۔‘‘ مینو چونک پڑی۔

’’تو نے اس کا نام کیوں لیا!‘‘

’’ایسے ہی۔ اب بتا دے۔ کب تک چھپائے گی۔ اور پھر مینو جیسے تڑپ کر اُبل پڑی۔

’’اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی اور وشال کے لوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں گھر کا سارا کام نمٹانے کے بعد وشال کا انتظار کر رہی تھی۔ اسکوٹر کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وشال اسکوٹر سے اتر رہا تھا اور سر تا پا پانی سے بھیگ گیا تھا۔ میرا دل تڑپ اُٹھا۔ آپ تو بالکل بھیگ گئے ہیں۔ جلدی سے کپڑے بدل لیجئے۔ ورنہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔‘‘ وشال ہنسنے لگا اور پھر اسکوٹر کی ڈکی میں سے ایک تھیلا نکال کر مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

’’مینو ڈیر، دیکھو مچھلی لایا ہوں۔ ذرا اسے تل دو جب تک میں کپڑے بدلتا ہوں۔‘‘

’’میں مچھلی لے کر اسی وقت کچن میں چلی گئی۔ مجھے وشال کا کام کرنے میں بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس لیے جلدی جلدی مچھلی صاف کی اس کے قتلے بنائے۔ اس میں مصالحہ لگایا اور پھر فرائی پین میں ڈال کر تلنے لگی۔ تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو جب وشال تک پہنچی تو اس نے وہیں سے آواز دی۔

’’مینو ڈیر ذرا جلدی۔‘‘

مجھے وشال کی بے تابی پر ہنسی آ گئی۔ اب تک صرف دو قتلے تیار ہو پائے تھے۔ اس لیے پلیٹ لے کر میں اٹھی تو خیال آیا کہ فرائی پین میں پڑے ہوئے قتلے جل جائیں گے۔ سکھیا اس وقت جھاڑو لگا رہی تھی۔ میں نے سکھیا کو آواز دی، وہ آئی تو میں نے اُسے پلیٹ تھماتے ہوئے کہا۔

’’اسے صاحب کے پاس لے جا اور پلیٹ لے کر جلدی سے آ جا۔ اس کے بعد سکھیا مچھلی کی پلیٹ لے کر وشال کے پاس جاتی رہی اور خالی پلیٹ لے کر آتی رہی مگر جب مچھلی کی آخری پلیٹ رہ گئی تو میں اُسے اُٹھا کر خود وشال کے پاس گئی۔ مگر کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اندر کمرے میں سکھیا وشال کی گود میں بیٹھی تھی اور وشال اُسے اپنے ہاتھوں سے مچھلی کھلا رہا تھا۔ میں چکرا کر گر پڑی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں۔‘‘

اتنا کہہ کر مینو چپ ہوگئی اور سدھا کے کانوں میں آواز گونجنے لگی:

مچھلی جل کی رانی ہے
جیون اس کا پانی ہے
ہاتھ لگاؤ گے ڈر جائے گی
باہر نکالو گے مر جائے گی

☆☆☆

ڈیڈی راستہ بھول گئے

زندگی کی راہیں اس قدر پر پیچ ہیں کہ کبھی کبھی اچھا بھلا ہوش مند شخص بھی راستہ بھول جاتا ہے۔کبھی اس لیے کہ اس کی رہ نمائی صحیح طور پر نہیں ہو پاتی اور کبھی کبھی خود اس کا ادراک اسے دھوکا دے جاتا ہے۔ایسا ہی نادر کے ساتھ بھی ہوا۔

ہر انسان کی اپنی الگ پسند، اپنی الگ نظر ہوتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ صالحہ جیسی خوب صورت سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ بیوی بھی نادر کو پسند نہ تھی۔صالحہ جیسی بیوی نصیب والوں کو ہی ملتی ہے۔مگر بات وہی پسند کی تھی۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادر اسے پسند نہیں کرتا، وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔

نادر کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔نادر ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔وہ ایک خوب رو شخص تھا۔اس کی وجاہت پہلی ہی نظر میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور سنجیدگی نے اس کے چہرے کو ایک وقار بھی عطا کیا تھا۔دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر دیکھنے والوں کی نگاہوں میں تحسین کے جذبات ابھر آتے۔ایسے خوب صورت اور وجیہ مرد سے شادی ہونے کے بعد صالحہ کو بہت خوش ہونا چاہئے تھا۔مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔اس کا سب سے بڑا دکھ میں تھا کہ نادر اسے پسند نہیں کرتا تھا۔صالحہ سے اس کی شادی ایک مجبوری تھی۔نادر کے والد نے صالحہ کو اس کے لیے پسند کر رکھا تھا اور جب نادر نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے والد نے اسے عاق کر دینے کی دھمکی دی۔شادی تو ہوگئی مگر نادر اپنے والد کی پسند کو اپنی پسند نہیں بنا سکا۔اس نے کبھی صالحہ کو اپنے دل کے قریب نہیں رکھا۔وہ اسے اس ایک ضرورت سمجھتا۔اس کا زیادہ تر وقت یا تو آفس میں گزرتا یا پھر کلب میں۔

گھر میں کوئی اور نہ تھا۔اکیلے پن کا احساس صالحہ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا۔وہ ایک تنہائی پسند عورت تھی۔پاس پڑوس سے بھی اس کی زیادہ دوستی نہ تھی۔اگر اس کی دوستی کسی سے تھی تو صرف کتابوں سے تھی۔مگر کتابیں آخر کتابیں ہی ہوتی ہیں۔وہ انسان کی دوست تو ہوسکتی ہیں،مگر انسان نہیں۔اس تنہائی کے کرب کا واحد سبب نادر کا سرد رویہ تھا۔وہ اسے کہیں گھمانے لے جاتا اور نہ اس سے سیدھے منہ بات کرتا۔اگر نادر ایک بار بھی اس سے مسکرا کر بات کر لیتا تو اسے اپنی زندگی اتنی تنہا تنہا نہ لگتی۔مگر نادر اس سے ضرورت کے مطابق ہی بات کرتا۔یہ چند لمحے بھی صالحہ اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتی تھی،مگر وقت تو بہتا دریا ہے۔یہ چند لمحے کیا معنی رکھتے ہیں؟ نادر کروٹ بدل کر خراٹے لیتا رہتا اور وہ کروٹیں بدلتی رہتی۔اسے یاد آتا کہ جب وہ چھوٹی تھی تو تتلیاں پکڑنے کی شوقین تھی۔مگر ہوتا یہ کہ جب کسی تتلی کو دیکھ کر وہ چپکے چپکے اسے پکڑنے کے لیے اپنی چٹکی بڑھاتی تو تتلی پھسل کر اڑ جاتی اور اس کی چٹکی میں صرف تتلی کے پروں کا رنگ چمکتا رہ جاتا۔نادر کی محبت بھی اس کے لیے ایسی ہی تھی۔

پھر شاید قدرت کو اس کی تنہائی پر رحم آگیا۔ایک دن اسے پتہ چلا کہ اب اس کے ساتھ ایک ننھی سی جان بھی رہنے لگی ہے۔نادر کو اس نے یہ خوش خبری جذبات کی شدت کے ساتھ لرزتے ہونٹوں سے سنائی،مگر نادر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔پھر بھی صالحہ کے دل میں امید کی کرن پیدا ہوگئی۔وہ جانتی تھی کہ ایک ننھا سا بچہ شوہر اور بیوی کے دلوں کو جوڑنے والا پل بن سکتا ہے۔اس لیے اب وہ نادر کی سرد مہری سے دل برداشتہ نہیں ہوتی کیوں کہ اب نادر تو خود اس کے وجود میں دھڑک رہا تھا۔وہ گھنٹوں اس کے تصور میں کھوئی رہتی،تنہائی میں اس سے باتیں کرتی اور اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے شکم میں پرورش پانے والا بچہ اس کی ساری باتیں سمجھتا ہے۔وہ اس کا ہم دم تھا،ہمراز تھا، دوست اور ساتھی تھا اور پھر ایک دن اس کا یہ ہمراز شکم سے اس کی گود میں آگیا۔

عادل ہو بہو اپنے باپ کی تصویر تھا۔وہی خوب صورت ناک نقشہ اور وہی

رنگت......صالحہ کی زندگی کو ایک نیا مفہوم مل گیا۔زندگی میں نئے رنگ شامل ہو گئے۔ان کے گھر میں پہلے بھی کوئی نوکر نہیں تھا۔عادل کی پیدائش کے بعد بھی اس نے کوئی نوکر نہیں رکھا۔وہ عادل کا سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی۔اس کا کام کرنے میں اسے ایک روحانی سکون ملتا۔مگر اسے یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی کہ نادر کو اس بچے سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا۔شاید اس لیے کہ وہ صالحہ کا بچہ تھا۔مگر اب صالحہ نے صبر کرنا سیکھ لیا تھا اور پھر اسے زندگی گزارنے کا ایک سہارا بھی مل گیا تھا۔

پانچ سال بیت گئے۔اس دوران نادر کے والدین ایک ایک کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔نادر کا رویہ روز بروز سرد تر ہوتا گیا۔اس کے دل میں کہیں یہ گرہ پڑی ہوئی تھی کہ اس کے والد نے اس کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے اوپر ہوئے اس ظلم کا بدلہ وہ صالحہ سے لیتا آ رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ صالحہ عادل کو بے انتہا چاہتی ہے،لہٰذا وہ جان بوجھ کر عادل کو بھی خود سے دور رکھتا۔جب وہ آفس سے گھر آتا تو عادل اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر اس کی گود میں جانا چاہتا،مگر نادر ناگواری سے اس کے ہاتھ جھٹک دیتا۔عادل کے ننھے دل میں محرومی کا احساس جاگزیں ہو گیا،مگر اپنی ماں کی طرح اسے بھی اپنے ڈیڈی سے پیار تھا۔وہ اپنے ڈیڈی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔اس کی گود میں ہمکنا چاہتا تھا۔اس کی بانہوں میں جھولنا چاہتا تھا۔مگر اس کی معصوم مسکراہٹ بھی نادر کا دل نہیں جیت سکی بلکہ وہ اس کی معمولی شرارت پر اسے پیٹ ڈالتا اور اسے پیٹ چکنے کے بعد وہ ایک انجانی کی مسرت محسوس کرتا۔

انتقام کے بھی کتنے رنگ ہوتے ہیں۔

عادل کی عمر کے بچے کھیل کود کے شوقین ہوتے ہیں،مگر عادل کو صرف ایک ہی شوق تھا......کہانیاں سننے کا۔شروع شروع میں تو صالحہ نے اپنا دل بہلانے کے لیے اسے کہانیاں سنانی شروع کیں،لیکن رفتہ رفتہ عادل کو کہانیاں سننے کا جنون سا ہو گیا اور پھر یہ حال ہو گیا کہ صبح سے لے کر رات گئے تک وہ اس سے کہانیاں سنانے کی فرمائش کرتا۔وہ کہتی۔’’بیٹے دودھ پی

لو۔‘‘ جواب ملتا،’’نہیں، پہلے کہانی سنائیے۔‘‘ وہ کہتی،’’بیٹا کھانا کھا لو۔‘‘ فرمائش ہوتی۔’’پہلے کہانی سنائیے۔‘‘ نتیجہ یہ ہوا کہ صالحہ کو جتنی کہانیاں یاد تھیں وہ سب اس نے سیکڑوں بار عادل کو سنا ڈالیں۔مگر مچھ، شیر، چیتے، ہاتھی گھوڑے سے لے کر گل بکاؤلی، قصہ چہار درویش اور گلزار نسیم تک کے قصے اسے سنا ڈالے،مگر اس کی سیری نہ ہوئی۔آخر کار صالحہ کو بیدی کی کہانی ’’بھولا‘‘ یاد آئی اور اس نے عادل کو یہ کہانی سنا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔مگر وہ پھر بھی باز نہ آیا۔وہ ایک ذہین بچہ تھا۔اس نے فوراً کہا۔

’’مگر بھولا کے ماما تو راستہ نہیں بھولے تھے۔وہ تو صرف دیر سے گھر آئے تھے۔‘‘

صالحہ لاجواب ہو گئی۔آخر زچ ہو کر بولی۔

’’بھولا کے ماما تو راستہ نہیں بھولے تھے،لیکن اگر تم اسی طرح دن میں کہانیاں سنتے رہے تو کوئی نہ کوئی مسافر ضرور راستہ بھول جائے گا۔‘‘

ادھر کئی دنوں سے نادر کے رنگ ڈھنگ صالحہ کو کچھ عجیب سے لگ رہے تھے۔اس نے خود پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دیا تھا۔اس کی سنجیدگی رخصت ہو گئی تھی۔ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا۔صالحہ کو یہ تبدیلی کچھ عجیب سی لگی،مگر اس کا سادہ ذہن معاملے کی گہرائی تک نہ پہنچ سکا اور ایک دن تو نادر رات بھر غائب رہا۔اس رات کو وہ بہت دیر تک بیٹھی جاگتی رہی۔عادل بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی اور جب اس نے اپنی ماں کو بستر پر بیٹھے دیکھا تو خود بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

’’کیا بات ہے ممی؟ آپ ابھی تک سوئی نہیں؟‘‘

’’نیند نہیں آ رہی ہے بیٹے!‘‘

’’ڈیڈی کہاں ہیں؟ ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے؟‘‘

"ڈیڈی!" ایک پھانس کی صالحہ کے دل میں اتر گئی۔

"ہاں، وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

عادل چپ ہو گیا۔ صالحہ نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ کبھی وہ خود سے سوال کرتی کہ آخر اسے کسی کا انتظار ہے؟ ایک ایسے شوہر کا جس کی نظر میں اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہے؟ پھر وہ خود کو سمجھاتی کہ اگر اسے اپنے شوہر کی محبت حاصل نہیں ہے تو کیا ہوا؟ شوہر کا نام تو اس کے ساتھ ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے تو ہیں اور پھر عادل نے تو اس کی محبت کو اپنی طرف موڑ ہی رکھا تھا۔ اب نادر بھی اس کی ایک ضرورت تھا۔ وہ عادل کا باپ تھا اور عادل کی پرورش کے لیے ایک باپ کو ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ سپنے میں وہ جانے کیا کیا دیکھتی رہی۔ عجیب اوٹ پٹانگ سے خواب آڑی ترچھی لکیریں۔ اور پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے دیوار گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی اور پھر اسے احساس ہوا کہ عادل اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ کمرے کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ عادل ایک ہاتھ میں ٹارچ لیے مین گیٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا کر رہے ہو، عادل؟" عادل نے ماں کو دیکھا تو سہم گیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔

"شاید ڈیڈی راستہ بھول گئے ہیں۔ میں انہیں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"

"ایں!" وہ چونک پڑی۔

عادل کہے جا رہا تھا۔

"اب میں آپ سے دن میں کبھی کہانیاں نہیں سنوں گا۔ ڈیڈی سچ مچ راستہ بھول گئے ہیں۔"

☆☆☆

مجھے پہچانا؟

جنگل میں ہر طرف سناٹا تھا۔ سارے چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے پڑے تھے۔ شاید خطرے کی بو ہوا میں رچ بس گئی تھی۔ ایک بوڑھا بندر ایک اونچے درخت کی شاخ پر دم سادھے سامنے بہتی ہوئی ندی کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک درخت کے نیچے جھاڑیوں میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ بندر نے چونک کر دیکھا۔ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ نیچے جھاڑیوں میں شیر بیٹھا تھا۔ بندر نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

"اے خدا! جنگل کے معصوم جانوروں کو اس درندے سے بچا۔" مگر اس نیک بندر کی دعا شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ اس نے دیکھا کہ ایک سیدھی سادی بکری سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے سے بے خبر سر جھکائے ندی کی جانب بڑھتی جا رہی ہے۔ بندر نے بے چینی کے ساتھ پہلو بدلا۔ اس نے چاہا کہ بکری کو آواز دے کر ہوشیار کر دے، مگر شیر نے اسے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اس نے ایک جست لگائی اور دوسرے ہی لمحے بکری شیر کا شکار بن چکی تھی۔

خون سے سنے منھ کو گھاس پر رگڑنے کے بعد شیر نے ایک آسودہ انگڑائی لی اور مستانہ چال چلتا ہوا اپنے ٹھکانے کی جانب بڑھ چلا۔ بندر جو یہ سارا تماشا چپ چاپ دیکھتا رہا تھا اب خاموش نہ رہ سکا اور اس نے جاتے ہوئے شیر کو دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔

"اے ظالم درندے! ان معصوم جانوروں کو زندگی سے کیوں محروم کرتا ہے؟"

شیر نے پہلے تو حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر غراتے ہوئے بولا۔

"بے وقوف بندر! کیا تو نہیں جانتا کہ شیر کا کام ہی شکار کرتا ہے۔ اگر میں شکار نہیں

کروں گا تو کھاؤں گا کیا؟''

میں نے قصے کو بیچ میں ہی چھوڑ دیا اور کتاب کو سرہانے رکھ کر آنکھ بند کر لیں۔ میں نے سونے کی کوشش کی، مگر نیند نہ آسکی۔ پھر دھیرے دھیرے بازگشت کی شکل میں مجھے ایک گزرا ہوا واقعہ یاد آ گیا اور میرے تصور میں ایک شیر کی شبیہ ابھری جسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے کھانا کھاتے دیکھا تھا، اس سے گفتگو کی تھی اور اس کے کردار کی تہوں کو پرت در پرت اُلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ شیر تھا شاہد......چمن منزل کا چشم و چراغ۔ مجھے بار ہا چمن منزل جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہم لوگوں سے اُن لوگوں کی دور کی رشتہ داری تھی۔ کچھ رشتہ داریاں ایسی ہوتی ہیں جو صرف شادی بیاہ کے موقع پر یا کسی کے انتقال پر سامنے آتی ہیں۔ سو ان لوگوں سے ہماری رشتہ داری ایسی تھی۔ اُن دنوں میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ پڑھتا کیا تھا، دن بھر پتنگیں اُڑایا کرتا، گولیاں کھیلتا یا پھر گھر والوں سے چھپ کر سنیما جایا کرتا۔ میرے بھیا پٹنہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ گھر آئے تو امی نے ان سے کہا۔

''شاہد! اسے بھی اپنے ساتھ پٹنہ لے جاؤ۔ یہاں پڑھتا لکھتا خاک نہیں۔ دن بھر آوارہ گردی کرتا ہے۔''

بھیا بھی پتہ نہیں کسی موڈ میں تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے میرا سامان بندھ گیا اور میں دوسرے ہی دن بھیا کے ساتھ پٹنہ پہنچ گیا۔

بھیا بی۔ این کالج کے پاس ایک پرانے دو منزلہ گھر کے اوپر والے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ اوپری منزل میں کل دو کمرے تھے۔ دوسرے کمرے میں ایک اور اسٹوڈنٹ رہتا تھا جو اُن دنوں اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ نچلی منزل پر ایک کرسچین ڈرائیور اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکے سارے جسم پر گھنے اور سخت بال تھے...... بالکل کسی ریچھ کی طرح۔ وہ روز رات کو دس بجے

دروازہ اندر سے بند کر کے اس میں تالا لگا دیا کرتا تھا۔ اگر کبھی ہم لوگوں کو دیر ہو جاتی تو وہ جلد دروازہ نہیں کھولتا تھا اور لگ بھگ آدھ گھنٹہ آواز لگانے کے بعد دروازہ کھلتا تو ساتھ ہی ساتھ مغلظات کا طوفان بھی ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ میرے بھیا صلح کل پر یقین رکھنے والے، ہمیشہ اس کی باتوں کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتے۔ میں کہتا کہ لاج بدل دیجئے تو کہتے، یہاں لاج میں جگہ ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جو ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔ مجھے پتہ نہیں اپنے بھیا سے پیار تھا یا عقیدت، میں ان کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیتا۔ بھیا اکثر مجھے ساتھ لے کر سوڈا فاؤنٹین چلے جاتے۔ جس جگہ پر آج کھادی گرام اُدیوگ کا آفس ہے وہاں ایک سوڈا فاؤنٹین ہوا کرتا تھا۔ کھلی جگہ میں جگہ جگہ چھتریاں لگی تھیں جن کے نیچے کرسیاں بھی تھیں۔ وہاں ہم دوسا کھاتے، کافی پیتے اور ٹھنڈی ٹھنڈی بہتی ہوئی ہوا کا لطف لیتے۔ ایسا ہفتہ میں بس ایک یا دوبار ہوتا ورنہ ہم لوگ زیادہ تر پٹنہ ہوٹل میں کھانا کھاتے جو لاج کے سامنے سڑک پر واقع تھا یا پھر بھی کبھی کسی اور ہوٹل میں جا کر کھا لیتے۔ کچھ بھی ہو وہ زندگی تھی بڑی آزاد اور بے پروا۔

مجھے پٹنہ گئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ وہ واقعہ پیش آ گیا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ دن بھر گرمی کا مقابلہ کرنے کے بعد شام کے وقت بھیا مجھے لے کر گھومنے نکل گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ گاندھی میدان میں گزارا۔ پھر سوڈا فاؤنٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے کھانا کھا کر نکلے تو نو بج چکے تھے۔ بھیا کا موڈ نائٹ شو دیکھنے کو ہو رہا تھا، مگر رات کو بارہ بجے دروازہ کھلوانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ چنانچہ ہم لوگ دل مار کر لوٹ پڑے۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو دیکھا کہ شاہد صاحب ایک اجنبی عورت کے ساتھ بیٹھے ہم لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی اس قدر غور سے نہیں دیکھا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، بلند و بالا قد۔ شیر جیسی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ بھیا کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے یار شاہد! کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کہاں چلے گئے تھے؟'' بھیا شاید اس گرم جوشی سے کچھ گھبرا گئے اور فوراً کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر بھیا نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے کہا کہ میں انہیں جانتا ہوں۔ اس کے بعد شاہد صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کا ہم سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری بھابھی ہیں۔''

''بھابھی؟''

بھیا کے لہجے میں حیرت تھی، کچھ بے یقینی بھی تھی۔ میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک آدی باسی عورت تھی یا شاید لڑکی تھی۔ اٹھارہ انیس سال عمر ہوگی۔ یوں تو ساری آدی باسی لڑکیاں ایک سی لگتی ہیں، مگر وہ ذرا مختلف تھی۔ وہ لال باڈر والی سفید ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور مانگ میں سیندور۔ شاہد صاحب نے کہا۔

''ہم نے سول میرج کر لی ہے۔'' میں نے دیکھا وہ شرما رہی تھی۔ اس کے سیاہ چمکتے ہوئے چہرے پر سچی شرم تھی۔

پھر انہوں نے اپنی نئی نویلی دلہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا دوست ہے، شاہد۔ ہم دونوں ہم نام ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے جو کچھ بتایا وہ کچھ یوں تھا کہ ان کی بیوی پٹنہ میڈیکل ہسپتال میں نرس ہے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی، عشق ہوا اور اب دونوں شادی کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ گھر والوں کو مناسب وقت آنے پر خبر کریں گے۔

گفتگو کے دوران اچانک بھیا نے چونک کر گھڑی کی جانب دیکھا۔

''اُف دس بجنے والے ہیں!''

''کیوں، کیا ہوا؟'' شاہد صاحب نے پوچھا۔

''دراصل دس بجے نیچے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔'' بھیا نے جواب دیا۔

''اوہ! دیکھو یار شاہد، آج تم سے بہت سی باتیں کرتی ہیں۔ ایسا کرو، آج ہم دونوں کے سونے کا یہیں انتظام کر دو اور ہاں بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانا وانا منگواؤ۔'' بھیا نے ان کی بات سن کر خاموشی کے ساتھ جیب سے پیسے نکالے اور مجھ سے کہا کہ ٹفن کیریئر لے کر جاؤ اور پٹنہ ہوٹل سے دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ۔''

میں کھانا لے کر آیا تو بھیا ان دونوں کے لیے بستر ٹھیک کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران بھی شاہد صاحب مسلسل باتیں کرتے رہے، جب کہ ان کی بیوی زیادہ تر خاموش ہی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کمرے کے اندر چلے گئے اور ہم لوگ کھلی چھت پر چادریں بچھا کر لیٹ رہے۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ جانے سے پہلے شاہد صاحب نے بھیا سے کہا۔

''یار شاہد! رات تم آئے نہیں؟ بہت انتظار دیکھا۔'' بھیا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد ایک دن جب میں اسکول سے واپس آیا تو دیکھا کہ تالے میں ایک پرزہ پھنسا ہے۔ کھول کر دیکھا تو لکھا تھا۔

''شاہد جی پرنام! کئی بار آپ کے پاس آئی، مگر آپ سے بھینٹ نہ ہو سکی۔ آپ کے دوست پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ کرپا کر کے مجھے ان کا پتہ بتا دیں۔ میں شام کو پھر آؤں گی۔''

شیر شکار کر کے جا چکا تھا۔ بھیا آئے تو میں نے پرزہ انہیں تھما دیا۔ وہ بہت پریشان

سے دکھائی دینے لگے اور اس کے آنے سے پہلے ہی مجھے ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ ہر دو تین دن بعد تالے میں ایک پرزہ پھنسا ہوا ملتا۔ ایک دن پرزے پر لکھا تھا۔

’’میں ایک بار اپنے سسرال والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔‘‘

اور پھر اگلے ہی دن اس نے ہمیں باہر نکلنے سے پہلے ہی آ گیا۔ وہ بہت کم زور اور دبلی لگ رہی تھی۔ مانگ میں سیندور بھی نہیں تھا۔ بھیا نے صبر وسکون کے ساتھ اس کی بات سنی اور کہا۔

’’دیکھئے، شاہد اسکول میں میرے کلاس فیلو تھے اور ہماری دوستی اسکول تک محدود تھی۔ میں آج تک ان کے گھر نہیں گیا اور نہ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔‘‘ یہ جھوٹ بولتے وقت بھیا کی آواز کی طرح لڑکھڑا گئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ ان کا جھوٹ پکڑ پائی یا نہیں۔ میرے جی میں آیا کہ اسے اسی وقت ان کا پتہ بتا دوں مگر بھیا کا چہرہ دیکھ کر میں چپ ہو رہا۔

اس پورے واقعہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھیا نے فوراً لاج بدل دیا اور مجھے اس بدذات ڈرائیور کی شکل دیکھنے سے نجات مل گئی۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ میں گھر گیا ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میں کسی کام سے بازار کی طرف نکل گیا۔ اچانک میری نظر شاہد صاحب پر پڑی۔ وہ ایک اوورکوٹ لادے، سر پر کیپ جمائے بڑی بے فکری کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ اسی درمیان ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں آگے بڑھ کر ان سے ملنا چاہتا تھا، مگر وہ تو مجھے دیکھ کر گویا گھبرا گئے اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک گلی میں گھس گئے۔ ایک لمحہ کو تو مجھے ان کی اس حرکت کا کوئی جواز نظر نہیں آیا۔ پھر خیال آیا کہ شاید ان کے دل میں چور بیٹھا ہے اور اسی لئے وہ چوروں کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہو گئی اور وہ دبئی چلے گئے ہیں۔

پندرہ سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ گزرتا ہوا وقت بہت سارے واقعات پر گرد کی موٹی موٹی تہیں جماتا گیا، مگر چند واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں وقت کی گرد بھی دھندلا نہیں کر سکتی۔ ان پندرہ برسوں میں کتنی ہی بار میرے ذہن میں شاہد صاحب کی شبیہ ابھر کر سامنے آئی۔

پندرہ سال بعد اچانک پھر ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان دنوں بھی میں اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ ایک دن پکچر دیکھ کر لوٹا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں وہ بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ بارہ تیرہ سال کا ایک تن درست وتوانا لڑکا بھی تھا۔ ان کے چہرے پر آج بھی ویسی ہی شادابی تھی۔ البتہ کنپٹیوں پر کہیں کہیں بال سفید ہو چلے تھے۔ مجھے دیکھ کر نہ تو وہ جھجکے، نہ گھبرائے بلکہ بڑی ہی ڈھٹائی سے پوچھ بیٹھے۔

’’مجھے پہچانا؟‘‘

’’جی ہاں! آپ کو تو میں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔‘‘ میں نے تیکھے لہجے میں جواب دیا، مگر میرے لہجے کی کاٹ کا شاید ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شرم کی ایک ہلکی سی لکیر بھی ان کی آنکھوں میں نظر نہیں آئی اور میں سوچنے لگا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص شیر ہے یا گیدڑ؟

☆☆☆

جواب

وہ بہت پریشان تھا۔ گناہوں کے دل دل سے نکلنے کی وہ جس قدر کوششیں کرتا اسی قدر اس میں دھنستا جاتا۔ وہ نمازیں پڑھتا، روزے رکھتا، دوسروں کی مدد کرتا اور بھی بہت کچھ مگر اسے احساس ہوتا کہ اسکے گناہوں کی گٹھڑی دن بدن بھاری ہوتی جاتی ہے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ یہاں سے کوسوں دور کسی پہاڑی پر ایک بزرگ رہتے ہیں جو لوگوں کو صحیح راستہ دکھاتے ہیں مگر وہ جلدی کسی کی بات کا جواب نہیں دیتے مگر جب وہ کسی کا جواب دینے پر آتے ہیں تو بولتے ہی چلے جاتے ہیں، سو وہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں اس کی باریابی ہوئی۔ دیکھا کہ ہرن کی چھال پر بزرگ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ سرخ و سفید چہرہ، سن سفید داڑھی، جسم پر بوسیدہ لبادہ اور ہونٹوں پر اللہ کا نام۔ وہ ان کے سامنے لرزتے دل کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور کافی دیر تک اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہا۔ پھر یوں گویا ہوا۔

''یا پیرو مرشد! میری مدد فرمائیے۔ میں بڑی مصیبتوں کو اپنے کاندھے پر لادے آپ کے در پر حاضر ہوا ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ تارک الدنیا ہیں۔ کسی سے ملتے نہیں، جلد کسی سے بات نہیں کرتے اور نہ ہر کسی کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں مگر میں نے لوگوں کی پروا نہ کی اور سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے، اس ناقابل عبور پہاڑی کو بدقت تمام سر کر کے آپ کے قدموں کی خاک لینے آیا ہوں۔ للہ مجھے ناکام و نامراد مت لوٹائیے گا۔ جب تک آپ میرے اس بے سکون دل کو جو طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، سکون نہ بخش دیں گے میں آپ کے قدموں کو نہ چھوڑوں گا۔ یا پیرو مرشد......!''

آنسوؤں میں ڈوبی تھرتھراتی لرزتی آواز سن کر بزرگ نے آنکھیں کھول دیں۔ چند ثانیوں تک وہ ساکت نظروں سے اسکی جانب یوں دیکھتے رہے گویا دیکھ کر بھی نہ دیکھ رہے ہوں۔ پھر ان کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ سینے سے ایک طویل سانس آزاد ہوئی اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسکے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔

''سر صرف خدا کے آگے جھکایا کرتے ہیں۔'' بزرگ کی آواز سن کر اس کے سارے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ بزرگ اس سے مخاطب تھے۔ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ مسرت سے اس کے ہونٹ کپکپا اُٹھے۔ اسی دوران اسے پھر بزرگ کی آواز سنائی دی۔

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے سنبھالا لیا۔ اپنے کپکپاتے جسم کو سیدھا کیا اور پھر یوں گویا ہوا۔

''یا حضرت! میں بہت پریشان ہوں۔ کئی بار حج کا ارادہ باندھا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی اڑچن راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ اس دفعہ بھی حج کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں مگر عین وقت پر......''

اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل کر اس کی داڑھیوں کو بھگونے لگی۔ اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا۔

''یا پیرو مرشد! کیا آقائے دو جہاں مجھ سے خفا ہیں؟ کیا خدا مجھ سے ناراض ہے؟؟ کیا میری قسمت میں حج کی سعادت حاصل کرنا نہیں لکھا ہے؟؟؟ میں جانتا ہوں کہ میں ایک گنہ گار اور سیہ کار بندہ ہوں۔ میں گناہوں سے بچنے کی بہت کوششیں کرتا ہوں مگر وہ جو نادیدہ ہے مجھے جہنم کی جانب ڈھکیلے جاتا ہے۔ ہر جگہ مجھے گھیرے رہتا ہے۔ سوچتا ہوں اس کو قتل کر دوں مگر وہ تو دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ان دیکھے دشمن پر وار کروں بھی تو کیسے؟ کیا شیطان کبھی دکھائی دیتا ہے؟

کیااسکی کوئی شکل وصورت بھی ہے؟ کیا وہ مجسم ہے؟؟ اگر ہاں تو اسکی پہچان کیا ہے؟؟؟؟؟''

بزرگ اس کی بات غور سے سنتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''ہاں وہ مجسم ہے۔وہ بہت خوبصورت ہے۔اسکی نگاہوں میں جادو ہے۔اسکی زبان بڑی شیریں ہے اوراسکی مسکراہٹ بڑی دل فریب ہے۔وہ ہمہ وقت تمہارے ساتھ رہتا ہے۔تمہارے جسم کے ایک ایک حصے میں رہتا ہے۔جب تم کسی کی غیبت کرتے ہو، بدگوئی کرتے ہو فحش کلامی کرتے، ہو، جھوٹ بولتے ہوتو اس وقت وہ تمہاری زبان پر ہوتا ہے اور جب تم کسی کی غیبت سنتے ہو فحش کلامی سنتے ہواور جھوٹی باتوں پر یقین کرتے ہوتو اس وقت وہ تمہارے کانوں میں ہوتا ہے۔ جب تم کسی کو بری نظر سے دیکھتے ہوتو اس وقت وہ تمہاری آنکھوں میں ہوتا ہے۔جب تم کوئی برا کام کرتے ہوتو اس وقت وہ تمہارے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔جب تم کسی غلط جگہ پر جانے کے لئے قدم بڑھاتے ہوتو اس وقت وہ تمہارے پیروں میں ہوتا ہے۔ جب تمہارا دماغ خالی ہوتا ہے تو وہ تمہارے دماغ میں براجتا ہے۔جب تم کسی نامحرم کے ساتھ تنہا ہوتے ہوتو اس وقت وہ تم دونوں کے درمیان ہوتا ہے اور جب تم نماز پڑھ رہے ہوتے ہوتو وہ تمہارے کاندھوں پر سوار رہتا ہے۔''

''نماز میں بھی......؟''

''ہاں نماز میں بھی۔کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو نماز کے دوران تمہارا دل دنیا کے الجھیڑوں میں الجھا رہتا ہے۔تم سے کہا گیا ہے کہ جب تم نماز کے لیے نیت باندھو تو یہ سوچو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ سوچو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے مگر تم ایسا نہیں کر پاتے۔''

اس نے شرمندگی سے نگاہیں جھکالیں۔ پھر دھیرے سے پوچھا۔

''اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''کچھ نہیں۔تم اپنا کام کرو۔اسے اپنا کام کرنے دو۔''

بزرگ نے آگے کہنا شروع کیا۔

''اور تم جانتے ہو کہ ایمان کے پانچ ستون ہیں۔توحید، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج۔ اب آؤ میں تمہیں ان کی حقیقت بتاؤں۔توحید کا مطلب خدا کو جاننا اور ایک ماننا ہے مگر تم دنیا کے ان گنت خداؤں کے آگے سر جھکاتے ہو۔ان کے حکموں پر چلتے ہو۔ان کے در پر سجدے کرتے ہو اور تم جب جب ایسا کرتے ہو اس پہلے ستون میں دراڑ پڑتی جاتی ہے۔تم نمازیں پڑھتے ہو مگر جب تمہیں خیال آتا ہے کہ لوگ تمہیں متقی اور پرہیزگار سمجھیں اور تمہاری پیشانی کے داغ کو نشان بزرگی جانیں تو یہ دوسرا ستون بھی......تم روزے رکھتے ہو مگر بر سر عام اس قدر مسواک کرتے ہو کہ تمہارے مسوڑھے چھل چھل جاتے ہیں اور منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ ایسا کر کے تم اپنے روزہ دار ہونے کا اعلان کرتے ہو۔سمجھو یہ تیسرا ستون بھی متزلزل ہوتا جاتا ہے۔تم زکوۃ دیتے ہو دل، پر جبر کر کے اور دینے کے بعد لوگوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہو۔ سمجھو یہ چوتھا ستون بھی اپنی بنیادوں سے ہل گیا۔تم حج کرتے ہو۔ اخبار و میں اسکی خبریں شائع کرواتے ہو۔شہر میں ڈھنڈورا پٹواتے ہو۔ دورانِ حج منیٰ کی پہاڑیوں پر چھوٹے بڑے شیطانوں کو کنکری مارتے ہو اس لیے کہ یہاں پر شیطان نے حضرت اسماعیل کو بہکایا تھا۔اب ذرا سوچو چودہ سو برسوں سے اتنی کنکریاں کھانے کے بعد کیا وہ صحیح سلامت رہ پاتا؟ ان کنکریوں کی چوٹ سے لہولہان ہو جاتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اب گیا کہ تب گیا۔مگر جب حجاج کرام خانہ کعبہ کے آگے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر جو نہیں جائز، اس کی دعائیں مانگتے ہیں تو یہ دعائیں ہوا کے دوش پر سوار ہر کر اس کے لیے مرہم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اس کے سارے جسم پر پھیل کر اسکے زخموں کو مندمل کر دیتی ہیں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا حج قبول ہوا مگر نہیں۔کیا تم نے ایک بزرگ کا قصہ نہیں سنا کہ ایک دفعہ انہیں خواب میں اپنے پیرومرشد کا دیدار ہوا۔انہوں نے

دریافت کیا۔ یا پیرومرشد! اس دفعہ کتنے لوگوں نے حج کیا اوران میں سے کتنے لوگوں کا حج قبول ہوا؟ جواب ملا۔اس بار پانچ لاکھ لوگوں نے حج کیا مگرایک کا بھی حج قبول نہ ہوا مگر ہاں ایک شخص کا حج قبول ہوا۔اوراس ایک شخص کی بدولت سبھوں کا حج قبول ہوا۔انہوں نے پھر دریافت کیا۔یا پیرومرشد!وہ بزرگ ہستی کون ہے؟ جواب ملا۔فلاں شہر کے فلاں محلے کی فلاں گلی میں فلاں نام کا ایک شخص رہتا ہے،اس کی طفیل سبھوں کا حج قبول ہوا۔وہ خواب سے بیدار ہوئے تو بے تابانہ پیر کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے اور پایا کہ ایک بوسیدہ سی جھونپڑی اپنی مفلسی اورکس مپرسی پرآنسو بہارہی ہے۔انہوں نے اس شخص کا نام لے کرآواز دی تو ایک ضعیف ونا تواں شخص باہرآیا اوراپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کرحیران ہوا۔انہوں نے اسے گلے لگالیا اوراسے یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ اس کا حج قبول ہوا۔وہ شخص اورحیران ہوا اور کہنے لگا۔

’’حج! کیسا حج میں نے تو حج کیا ہی نہیں؟‘‘

اب حیران ہونے کی ان کی باری تھی۔ یا اللہ یہ کیا اسرار ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ انہوں نے اس شخص کا نام پوچھ کرخوب اچھی طرح تشفی کر لی اور کہا حضور میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کا حج قبول ہوا۔تب اس شخص نے روتے ہوئے فرمایا کہ مدت سے حج کی تمنا تھی۔ میں غریب ونادار شخص ہوں۔ پائی پائی مہیا کر کے حج کے لیے رقم جمع کی تھی۔اس دوران میری بیوی سخت بیمار پڑی مگر میں نے وہ رقم اس کے علاج پرخرچ نہیں کی۔خیر خدا کی مہربانی سے وہ لوٹ پوٹ کراچھی ہوگئی۔ایک دن کہنے لگی،’’عرصہ ہوا اچھا کھانا نہیں ملا۔آج گوشت کھانے کی بڑی خواہش ہورہی ہے۔کہیں سےتھوڑا گوشت لے آؤ۔‘‘ میں نے کہا،’’کیا تو چاہتی ہے کہ میں حج کے سعادت سےمحروم رہوں؟‘‘ تب وہ کہنے لگی،’’اچھا! پڑوسی کے یہاں چلے جاؤ۔ وہاں سے گوشت بھونے جانے کی خوشبوآرہی ہے۔ازراہ خداتھوڑا سا گوشت مانگ

لاؤ۔‘‘ مجھے پڑوسی سے مانگتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہورہی تھی مگرناچاراس کے دروازے پر گیا اوردست سوال دراز کیا۔میری بات سن کر پڑوسی رونے لگا۔پھریوں گویا ہوا کہ آج میرے یہاں گوشت پکا تو ہے مگر وہ تم لوگوں کے لیے حرام ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ کئی دنوں سے فاقے سے تھےاورملک الموت دروازے پردستک دینے والا تھا۔چنانچہ جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے خدا کے حکم سے ایک مردار اُٹھا لایا اوراس کا گوشت.....‘‘اتنا سننا تھا کہ میں عرق عرق ہوگیا۔میرا پڑوسی ہفتوں سے بھوکا تھا اور مجھے خبرتک نہ ہوئی۔تف ہے میری زندگی پر۔میں الٹے قدموں لوٹا اورحج کے لیے جورقم جمع کی تھی وہ اس کے حوالے کردی۔‘‘

وہ دم بخود بزرگ کی باتیں سنتا رہا۔اندر کی سانس اندراور باہر کی سانس باہر تھمی کھڑی رہی۔

بزرگ نے دھیرے سے پوچھا۔

’’کیا آج کوئی ایسا شخص ملے گا؟‘‘ پھر بزرگ نے گویا سرگوشیوں میں کہا۔

’’تمہیں ہدایت کی گئی ہے کہ حلال رزق کماؤ۔حرام مال سے بچومگرتم دونوں ہاتھوں سے غلط طریقے سے حاصل کی گئی دولت کو اکٹھا کرتے ہو اور پھراس حرام مال سے ثواب کمانا چاہتے ہو۔بولو کیا یہ ممکن ہے؟‘‘

بزرگ کی باتیں سن کراسے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔اسے محسوس ہوا کہ اس کی چوری پکڑی گئی۔اب اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ بچا تھا۔بزرگ نے پھرآنکھیں بندکر لی تھیں اوروہ شرمندہ،ناکام ونامراد واپسی کے لیے مڑگیا تھا۔اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

☆☆☆

جادوگر

وہ ہوا میں معلق تھا۔

اوپر آسمان تھا اور نیچے زمین......

لیکن وہ نہ تو آسمان پر تھا نہ زمین پر......

وہ تو بس ہوا میں معلق تھا۔

ہوا یوں کہ ایک مصروف شاہراہ کے کنارے ایک جادوگر اپنا تماشا دکھا رہا تھا۔اس کے سر پر ایک لمبا سا ہیٹ تھا، آنکھوں پر خوبصورت فریم کا چشمہ، ہلکی سفید مونچھیں اور منہ میں سگار۔سگار کو سلگایا نہیں گیا تھا۔شاید وہ صرف ایک نمائشی حربہ تھا۔اس نے ملگجے رنگ کا ایک لانبا سا اُورکوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اسی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔پیروں میں گرد آلود لیکن مضبوط جوتے تھے۔گویا اس کی زندگی اسفار سے عبارت تھی۔اس کے کاندھے پر ایک بڑی سی زنبیل تھی جس میں دنیا بھر کے تجربات ومشاہدات بند تھے۔اس نے زنبیل ایک جانب رکھی اور کوٹ کی جیب سے ایک ڈگڈگی نکال کر اسے بجانا شروع کیا۔ڈگڈگی کی آواز سن کر راہ گیر اس کی جانب متوجہ ہونے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد تماش بینوں کی بھیڑ لگ گئی۔اس بھیڑ میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔لیکن کوئی عورت نہ تھی۔جب بہت سارے لوگ جمع ہو گئے تب اُس نے اپنے منہ میں دبے سگار کو نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پھر اس کی زبان سے سحر زدہ کرنے والے الفاظ نکلنے لگے۔اُس کی زنبیل میں دنیا بھر کے قصے تھے جنہیں وہ مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔مجمع اس کی باتوں کو بہت غور سے سن رہا تھا۔اس کی باتوں پر زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔وقفے وقفے سے وہ

تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور اس دوران گہری نظروں سے تماش بینوں کو دیکھتا۔اس کی خاموشی پر بھی تالیاں بجتیں اور جب تالیوں کی گڑگڑاہٹ ختم ہو جاتی تو وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتا۔جب اُس کے قصے سنانے کا سلسلہ ختم ہوا تو اُس نے ایک دس گیارہ برس کے بچے کو اشارے سے اپنی جانب بلایا۔پہلے تو وہ ہچکچایا، پھر اُس نے مُڑ کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔والد نے اسے آنکھ کے اشارے سے اجازت دے دی۔تب وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا جادوگر کے پاس پہنچا۔جادوگر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔پھر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔بچے کی آنکھیں مُندنے لگیں۔منتر پڑھ چکنے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اُڑ جاؤ۔''اور بچے کسی پرندے کی طرح آسمان کی جانب اُڑ چلا۔تالیوں کے شور سے آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی شور مچاتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگے۔جب وہ بچہ کچھ اونچائی پر پہنچ گیا تب جادوگر زور سے چلایا۔

''رُک جاؤ۔''بچہ وہیں رک گیا۔

تماش بینوں نے ایک بار پھر تالیوں سے خراج تحسین پیش کیا۔جادوگر نے اپنے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور مجمع سے پوچھا۔

''کیا کوئی اس بچے کو زمین پر واپس بلا سکتا ہے؟''

لوگ ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔پھر ایک شخص نے اس بچے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

''نیچے آو۔''لیکن اس کے حکم کا بچے پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور ہوا میں معلق رہا۔جادوگر نے ایک بار پھر مجمع پر یوں نظریں دوڑائیں۔گویا وہ سبھوں کو چیلنج دے رہا ہو۔پھر سبھوں نے مل کر ایک ساتھ آواز لگانا شروع کیا۔

''نیچے آؤ، نیچے آؤ۔'' لیکن بچہ بدستور اپنی جگہ پر معلق رہا۔

تب اس نے بچے کی جانب اپنی انگلی اٹھا کر کہا۔

''نیچے آؤ۔'' بچہ آہستگی کے ساتھ زمین پر اتر آیا۔لوگوں نے ایک بار پھر زبردست تالیاں بجائیں۔

اس کے بعد جادوگر نے اور کئی لوگوں کے ساتھ یہ جادو دکھایا۔ان میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔

اب شام ہو چلی تھی۔ جادوگر نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔تبھی ایک شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور ملتجیانہ انداز میں یوں گویا ہوا۔

''سر! پلیز، مجھے بھی اُڑا دیجیے۔'' جادوگر نے اس کی جانب چونک کر دیکھا کیونکہ یہ پہلا شخص تھا جو خود ہی اُڑنا چاہ رہا تھا۔جادوگر خاموش تھا۔اُس شخص نے اس کی خاموشی کا نہ جانے کیا مطلب نکالا کہ وہ اس کی خوشامد پر اُتر آیا اور اس کی قصیدہ خوانی کرنے لگا۔جادوگر کے چہرے پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے اس شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جانب کیا اور بآواز بلند مجمعے سے مخاطب ہوا۔

''کیا میں اسے بھی اُڑا دوں؟''

''ہاں، ہاں، ضرور، کیوں نہیں!'' ہر طرف سے یہی آواز آنے لگی۔تب وہ اس شخص کے مقابل آ کھڑا ہوا۔اب دونوں آمنے سامنے تھے۔اس کے بعد جادوگر نے وہی منتر پڑھنا شروع کیا۔اس شخص پر تنویمی کیفیت پیدا ہونے لگی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔اُس کے بعد جادوگر نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں اُٹھا کر کہا۔

''اُڑ جاؤ۔'' اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص ہوا میں اُڑ چلا۔جب وہ کافی اونچائی پر پہنچ

گیا تو جادوگر نے اس کی جانب انگلی کے اشارے سے کہا۔

''رُک جاؤ۔'' اور وہ وہیں پر رُک گیا۔مجمعے پر ایک بار پھر جوش طاری ہو گیا اور پوری فضا تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ ہوا میں معلق شخص نے نیچے زمین پر نظر ڈالی۔ ہر آدمی اسے بونا دکھائی دینے لگا اور اسے اپنی ذات بلند، بہت بلند لگنے لگی۔اس کی آنکھوں میں غرور کا نشہ تیر گیا اور ہونٹ تفاخرانہ انداز میں پھیل گئے۔

جادوگر نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔لوگوں میں اب بے چینی پھیلنے لگی۔وہ کہنے لگے۔

''ارے، پہلے اسے زمین پر تو واپس بلاؤ۔'' جادوگر نے ایک نظر ہوا میں معلق شخص پر ڈالی۔اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ پھر اس نے مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اِس شخص کو اونچائی پر پہنچنے کا بہت شوق تھا۔اب اسے وہیں رہنے دیں۔زمین سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہے۔اب یہ زندگی بھر ہوا میں معلق رہے گا۔

☆☆☆